فلسفۂ احکام

اُستاد ناصر مکارم - اُستاد جعفر سُبحانی

فسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون ﴿النحل ۴۳﴾

فلسفۂ احکام

استاد ناصر مکارم شیرازی

استاد جعفر سبحانی

جامعہ تعلیمات اسلامی پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی۔ پاکستان

ترجمہ ________ محمد فضل حق
نظر ثانی ________ رضا حسین رضوانی
کتابت ________ اشرف راحت
مصحح ________ کاظم علی گجراتی

جملہ حقوق محفوظ ہیں: یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ ہذا کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریتاً کرائے پر دیجائیگی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کیجائیگی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنیوالے پر یہ شرط عائد نہ کرنیکے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی
جامعہ تعلیمات اسلامی

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ **جامعہ تعلیمات اسلامی** دنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک انگریزی، اردو، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ستر سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اُسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ **جامعہ** کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ چھ برسوں سے قوم کے بچّے بچیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دعا ہے کہ خداوندِ منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے۔

تعاون کا طلبگار (الشیخ) یوسف علی نفسی نجفی
وکیل حضرت آیۃ اللہ خوئی دام ظلہ العالی (نجف اشرف)

قارئین گرامی!

یہ کتاب ادارہ **جامعہ تعلیمات اسلامی** کی مطبوعات میں سے ہے۔ ادارہ ہذا کی مطبوعات کی اشاعت کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اجاگر کرنا ہے۔

اس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گراں قدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔

آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آراء تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس ارشادِ ربانی کی تعمیل ہو سکے:

"(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو"

(سورۂ سبا۔ آیت ۴۶)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار

سکریٹری نشرواشاعت

فلسفۂ احکام کے بارے میں
شہزادیٔ اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ کے خطبے کا اقتباس

اللہ نے قرار دیا:

ایمان کو تاکہ وہ تمہارے دلوں کو شرک سے پاک کردے،

نماز کو تاکہ تمہارا کبر و نخوت کا خیال مٹ جائے،

زکات کو تاکہ تمہارا قلب صاف ہو اور تمہارا مال بڑھے،

روزے کو تاکہ تمہارے اخلاص میں پختگی آئے،

حج کعبہ کو تاکہ دین اسلام کو قوت اور شوکت ملے،

عدل کو تاکہ تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ دے،

امامت اہلبیتؑ کو تاکہ امت اختلاف و انتشار سے بچے،

جہاد کو تاکہ اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی عزت قائم رہے،

امر بالمعروف کو تاکہ عوام الناس کی اصلاح ہوتی رہے،

صلۂ رحم کو تاکہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہے،

قصاص کو تاکہ لوگوں کی جان محفوظ رہے۔

عناوین

کیا ہم فلسفۂ احکام کے بارے میں سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں ؟ ۱۵
فلسفۂ احکام کے بارے میں غور و فکر کیسے کیا جائے ؟ ۲۲
دینی مسائل میں تقلید کیوں کی جائے ؟ ۲۸
ہم اللہ کی عبادت کیوں کریں ؟ ۳۴
اعلم کی تقلید کیوں کرنی چاہیے ؟ ۴۳
نماز عربی میں کیوں پڑھنی چاہیے ؟ ۴۵
نماز پڑھتے وقت رو بقبلہ کیوں کھڑا ہونا چاہیے ؟ ۴۷
ہم پنجگانہ نمازیں تین وقت میں کیوں پڑھتے ہیں؟ ۴۹
نماز انسان کو گناہ سے کیونکر باز رکھتی ہے ؟ ۵۵

نماز آیات کا کیا مقصد ہے ؟	۶۱
عورت کو نماز کی حالت میں اپنا بدن کیوں ڈھانپنا چاہیے ؟	۶۵
الکحل سے تیار کردہ مشروبات کیوں نجس ہیں؟	۶۷
پسینے اور پیشاب میں کیا فرق ہے ؟	۷۰
مُردوں کو غسل دینے اور غسل مس میت کا فلسفہ کیا ہے ؟	۷۲
ناجائز بچے بعض مناصب سے کیوں محروم ہیں؟	۷۶
صحت کے لیے سوّر کے گوشت کے مضر اثرات	۸۲
کافر کیوں ناپاک ہے ؟	۸۵
جزیے کا کیا مقصد ہے ؟	۸۸
احرام کا لباس	۹۲
قربانی کا گوشت تلف کیوں ہو جاتا ہے ؟	۹۴
گمراہ کُن کتابوں کا پڑھنا حرام کیوں ہے ؟	۹۷
قرآن کریم کسی غیر مسلم کو کیوں نہیں دیا جا سکتا؟	۱۰۰
بعض جرائم کے ثابت کرنے میں سخت گیری کی وجہ؟	۱۰۲
حیوان کو مخصوص شرائط کے تحت کیوں ذبح کرنا چاہیے ؟	۱۰۵
ختنہ	۱۰۷
حلل کا فلسفہ	۱۰۹
جنسی بے راہ روی کے جسمانی اور نفسیاتی خطرات	۱۱۲
دو خونی رشتہ داروں کا آپس میں شادی کرنا کیسا ہے ؟	۱۱۹
موسیقی اسلام کے نقطۂ نظر سے	۱۲۳

خدا کی جانب سے بندوں کی آزمائش کا کیا مقصد ہے ؟ ۱۲۸

جو مٹی جراثیم سے آلودہ ہو اس پر تیمم کیسے کیا جا سکتا ہے ؟ ۱۳۳

کیا دوسرے مذاہب برحق ہیں ؟ ۱۳۵

صراطِ مستقیم کی جانب ہدایت کا تقاضا ۱۴۱

آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا کیا مقصد ہے ؟ ۱۴۳

سات آسمانوں سے کیا مراد ہے ؟ ۱۴۶

دو مشرق اور دو مغرب کہاں ہیں ؟ ۱۵۰

زمین کا کُروی ہونا اور قرآن مجید ۱۵۳

زمین کی وضعی حرکت ۱۵۶

اس آیت کی تفسیر کیا ہے ؟ ۱۶۰

شب قدر کی کیا اہمیت ہے ؟ ۱۶۲

ذوالقرنین نے کیسے دیکھا کہ سورج تاریک پانی میں ڈوبتا ہے ؟ ۱۶۵

قرآنِ مجید اور آسمانی کرّوں کی تسخیر ۱۶۸

کیا یہ آیت دورِ حاضر کے وسائل نقلیہ کی جانب اشارہ کرتی ہے ؟ ۱۷۱

کیا یہ آیات انواع کے ارتقاء کے نظریے کی تائید کرتی ہیں ؟ ۱۷۳

کیا یہ آیت اسلام کے آفاقی ہونے کے منافی ہے ؟ ۱۷۷

خداوند تعالےٰ اپنے لیے ضمیر "جمع" کیوں استعمال کرتا ہے ؟ ۱۷۹

قرآن مجید میں سمع اور بصر ۱۸۱

جھوٹے معبود کیوں جلائے جائیں گے ؟ ۱۸۳

کیا خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہے ؟ ۱۸۵

توبۂ "نصوح" سے کیا مراد ہے ؟ ۱۸۷

کیا یہ آیت مسئلہ "خلود" سے منافات رکھتی ہے ؟ ۱۸۹

ہر کام شروع کرتے وقت خدا کا نام لینے کا کیا فائدہ ہے ؟ ۱۹۱

قرآن مجید کا تحریف سے محفوظ ہونا ۱۹۳

قرآن مجید کی سورتوں کے نزول کی ترتیب اور کاتبان وحی ۱۹۹

اپنی رائے سے تفسیر کرنا ۲۰۱

قرآن مجید میں تکرار کا مقصد کیا ہے ؟ ۲۱۰

کیا ممنوعہ درخت دانش کا درخت ہے ؟ ۲۱۳

سورۂ برائت کے شروع میں بسم اللہ کیوں نہیں ؟ ۲۱۹

انفاق کو ۷۰۰ دانوں والی گندم کیوں تشبیہ دی گئی ؟ ۲۲۲

قرآن میں پسر نوحؑ ۲۲۶

کیا یہ آیت پیغمبر کے معصوم ہونے سے ہم آہنگ ہے ؟ ۲۲۸

کل شئ ھالك الا وجهه سے کیا مراد ہے ؟ ۲۳۲

حضرت یوسفؑ نے اس بات کی اجازت کیونکر دی کہ
ان کے بھائی پر تہمت لگائی جائے ؟ ۲۳۴

کیا کم ہنسنا اور زیادہ رونا چاہیے ؟ ۲۳۶

یوم حشر سوال ہوگا یا نہیں ؟ ۲۳۸

کیا پیغمبر بھی مشورہ کرتا ہے ؟ ۲۴۰

صغیرہ و کبیرہ گناہ کیا ہیں ؟ ۲۴۲

کیا گناہوں کا صغیرہ وکبیرہ ہونا نسبتی ہے ؟ ۲۴۴
کبیرہ گناہ کتنے ہیں ؟ ۲۴۶
دروغ مصلحت آمیز کیا چیز ہے ؟ ۲۴۸
کیا عورت کو جسمانی سزا دینا جائز ہے ؟ ۲۵۱
مصنوعی تلقیح اسلام کے نقطہ نظر سے ۲۵۳
عورتوں کو حاملہ ہونے سے باز رکھنے کے
بارے میں کیا حکم ہے ؟ ۲۵۶
نامشروع جنین کے سقط کے بارے میں
کیا حکم ہے ؟ ۲۵۸
خون چڑھانا ۲۵۹
کیا خلوص نیت اس عمل سے منافات نہیں رکھتا ؟ ۲۶۰
ہم بعض اوقات عصر کی نماز ظہر کے وقت
کیوں پڑھتے ہیں ؟ ۲۶۲
کیا سب اعمال کے قبول ہونے میں نماز
کا دخل ہے ؟ ۲۶۴
قطبی علاقوں میں نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے
کا عمل کیسے انجام دیا جائے ؟ ۲۶۶
اول وقت میں نماز ۲۷۰
قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے کا مقصد ؟ ۲۷۲
شطرنج کے کھیل کے بارے میں کیا حکم ہے ؟ ۲۷۴

لاطینی زبان بولنے والے نماز کیسے پڑھیں ؟ ۲۷۸
امام کی قبر کا سجدہ ۲۸۰
ان ورزشوں کے بارے میں کیا حکم ہے ؟ ۲۸۲
ایک امریکی مسلمان کے سوالات ۲۸۳
عہدِ رفتہ میں مسلمانوں کی ترقی
اور عصر حاضر میں ان کی پسماندگی ۲۹۳
کی وجوہات کیا ہیں ؟
نوجوان دینی اجتماعات سے دُور کیوں ۲۹۸
بھاگتے ہیں ؟
تعداد ازواج سے غلط استفادہ کرنے پر کیسے قابو پایا جائے ؟ ۳۰۰
کیا اسلام نے عورت کے فرائض معین کیے ہیں؟ ۳۰۳
کیا کائنات اپنی بقاء کے لیے خدا کی محتاج ہے؟ ۳۰۵
چھینک کے بارے میں اسلام کا نظریہ ۳۱۱
کیا یہ خوابنامہ صحیح ہے ؟ ۳۱۲
کیا خمس رسالت کا صلہ ہے ؟ ۳۱۴
کیا خمس طبقاتی امتیاز کا موجب نہیں ؟ ۳۱۶
اس قدر شوق دلانے کے باوجود ۳۱۸
یہ جہالت کیوں ہے ؟
کیا اچھے لوگوں کو بھی نماز پڑھنی چاہیے ؟ ۳۲۰
کیا انسان فرشتوں سے برتر ہے ؟ ۳۲۲

لڑکوں اور لڑکیوں کا بالغ ہونا	۳۲۴
مراجع دینی کی تقلید	۳۲۵
دو اہم احکام	۳۳۲
کیا امیرالمومنینؑ نے اپنی خلافت پر حدیث غدیر سے استدلال کیا ؟	۳۳۵
کیا ایثار و قربانی ممکن ہے ؟	۳۴۱
یضل من یشاء ویھدی من یشاء کا کیا مقصد ہے ؟	۳۴۵

گفتنی ہا

اسلام نے کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ کاموں کے کرنے سے روکا ہے۔ ان دونوں باتوں کی بنیاد کسی نہ کسی مصلحت پر ہے اور دینی احکام بلاوجہ مقرر نہیں کیے گئے ہیں مثلاً کھانے پینے کی چیزیں، قانونی تعلقات اور بہت سی دوسری باتیں ہیں کہ ان کی ذات میں کوئی نہ کوئی نفع یا نقصان مضمر ہے چاہے ان کے متعلق کوئی قانون بنایا جائے یا نہ بنایا جائے، ان کے ذاتی اثرات میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ منہیات پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ منشیات اور الکحلی مشروبات بذات خود نقصان دہ ہیں۔ سود محض عوام کے استحصال کے لیے ایک جال ہے لہٰذا شراب اور سود اگر حرام قرار دیے گئے ہیں تو اس کی وجہ ان کے مضر اثرات ہیں۔ دوسری طرف اگر آپ اوامر پر نظر ڈالیں تو آپ محسوس کریں گے کہ تمام عبادات اور بطور مثال نماز اور زکات کے فرض کیے جانے کی وجہ ان کے وہ فوائد ہیں جو ان سے انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اسلامی احکام کی بنیاد نفع یا نقصان اور خوبی یا برائی پر ہے۔ ان میں سے بہت سی باتوں کو علم اور تجربے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی تحقیق یا کسی اسلامی حکم کا فلسفہ معلوم کرنا اور اس کے بارے میں سوال کرنا منع نہیں ہے۔

"سوال" انسان کی حقیقت جوئی اور اس کی سچی روحانی طلب کا بہترین مظہر نیز اسکی ترقی کے لیے ایک کھلا ہوا دروازہ ہے۔ "سوال" مخفی اور نامعلوم باتوں تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر انسان کی لگاتار کوشش کا ایک زندہ نشان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال نہیں کرتے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ "سوال" کی اسی افادیت کے پیش نظر دین اسلام، جو انسانی ترقی کے لیے ایک مکمل آئین ہے، نہ صرف اپنے پیروؤں کو مختلف مسائل کے متعلق سوال کرنے کا حق دیتا ہے بلکہ ہادیانِ اسلام نے بھی بارہا لوگوں کو مختلف علمی مسائل کے بارے میں سوال کرنے کی دعوت دی ہے۔ زمانہ خطیبِ منبرِ سلونی کا وہ یادگار جملہ ابھی بھولا نہ ہوگا جس میں آپ نے فرمایا تھا: "پوچھو! جو کچھ تمہیں پوچھنا ہے۔" چنانچہ اہلبیتِ رسولؐ نے اپنے پیروؤں کے سوالوں کے جو جوابات دیے ہیں ان سے نہ صرف ان لوگوں کے فکر و نظر کو جلا ملی بلکہ آج بھی حقیقت کے متلاشی خاندانِ وحی و نبوّت کے گرانمایہ علمی سرمائے سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

☐ **جامعہ تعلیمات اسلامی** جو اسلام کی خدمت گزار ہے اسی سرمائے کے ابلاغ میں کوشاں ہے چنانچہ جامعہ فلسفۂ احکام پر مبنی ایک مستقل کتاب پیش کر رہی ہے۔

☐ اس کتاب میں آیات کی تفسیر، فقہی مسائل اور بعض دیگر موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ امید ہے کہ ہماری یہ پیشکش ان لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو گی جو اسلامی مسائل کو عقلی و نقلی دلائل کیساتھ سمجھنے کے خواہشمند ہیں۔

ادارہ

کیا ہم فلسفۂ احکام کے بارے میں سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں؟

اس وقت ہم جن اہم ترین بحثوں سے سروکار رکھتے ہیں ان میں سے ایک بحث اسلام کے احکام، قوانین اور قواعد وضوابط کے فلسفے کے بارے میں ہے اور سوالات اور جوابات کا کافی حصہ اسی پر مشتمل ہے۔

"ہر شخص اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ نماز کیوں پڑھنی چاہیے؟ بیت اللہ کی زیارت کے لیے کیوں جانا چاہیے؟ اسلام میں سود خوری کیوں حرام ہے؟ سور کے گوشت کی حرمت کے پیچھے کیا فلسفہ کارفرما ہے؟ اسلام میں ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنا کیوں جائز ہے؟ سونے اور چاندی کے برتنوں کے استعمال کے حرام ہونے کی کیا وجہ ہے؟ ...... وغیرہ وغیرہ"

بعض اہلِ علم اور صاحبِ نظر حضرات نے اس سلسلے میں بڑی مفید اور دلچسپ بحثیں کی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے مسئلے کے ایک پہلو کا انتخاب کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ ہمیں احکام کے فلسفے کی چھان بین نہیں کرنی چاہیے اور بعض اس کے برعکس

فلسفۂ احکام کا سمجھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

ان حضرات کے خیالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

اگر آپ کو تعجب نہ ہو تو ہم کہیں گے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق دونوں گروہ درست کہتے ہیں۔ ہم یہ حق رکھتے بھی ہیں اور نہیں بھی رکھتے۔ مراد یہ ہے کہ ہر گروہ کا استدلال بطور کلی نہیں بلکہ اس کا ایک مخصوص اور معین حصہ قابلِ قبول ہے۔

اس اجمال کی توضیح یوں کی جا سکتی ہے:

قرآن مجید، رسول اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام کی احادیث اور ان کے اصحاب اور رفقاء کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ ان کے مابین احکام کے فلسفے کے بارے میں بحث کا ہمیشہ رواج رہا ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ وہ قرآن مجید کے طریق کو ایک آزاد استدلالی اور منطقی طریق سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو یہ حق دیتے تھے کہ احکام کے بارے میں مباحث کے سلسلے میں بھی اس طریقے سے استفادہ کرتے ہوئے دینی احکام کے فلسفے کے بارے میں سوال کریں۔

اصولاً اسلام خدا کا تعارف یوں کراتا ہے:

وہ ایک ایسا وجود ہے جو علم اور حکمت کے نقطۂ نظر سے لامحدود ہے اور ہر چیز اور ہر شخص سے بے نیاز ہے۔ اس کے تمام کام ایک خاص حکمت کے مطابق ہوتے ہیں خواہ ہم اس حکمت کو سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ بیکار، لغو اور فضول چیزوں کا اس کے کام میں کوئی دخل نہیں اور اس نے پیغمبروں کو تعلیم و تربیت اور حق اور عدالت کی جانب دعوت دینے کے لیے بھیجا ہے۔

خداوند کریم کا ایسا تعارف ہمیں احکامات اور ان کے اثرات کے فلسفے کے بارے میں سوال کرنے کا شوق دلاتا ہے جو وہ فطری طور پر ہماری زندگی، خوش بختی اور تقدیر پر اثر ڈالتے ہیں۔

اگر ہم تصور کریں کہ قرآن مجید کا طریقہ فروعِ دین اور علمی مسائل کے بارے میں نہیں

بلکہ فقط اصول دین اور اعتقادی مسائل کے بارے میں استدلال کا ہے تو یہ ہماری بھول ہوگی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید ماہ رمضان المبارک میں روزے رکھنے کا حکم دینے کے بعد فرماتا ہے:

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" (سورہ بقرہ آیت ۱۸۳)

تم روزے رکھو تاکہ پرہیزگار بن جاؤ۔

یوں وہ بتاتا ہے کہ روزے کا فلسفہ گناہوں سے پرہیز ہے جو اس مخصوص اسلامی ریاضت اور نفسانی خواہشوں پر تسلط کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔

مسافروں اور بیماروں کے بارے میں جو کہ روزے کے حکم سے مستثنیٰ ہیں کہتا ہے:

"يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (سورہ بقرہ۔ آیت ۱۸۵)

اور سختی، غلطی اور مشقت کی نفی کو اس کا فلسفہ قرار دیتا ہے۔

جوئے اور شراب کے حرام ہونے کے بارے میں کہتا ہے:

"إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ" (سورہ مائدہ آیت ۹۱)

شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور نفاق کا بیج بودے اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے باز رکھے، تو کیا تم اس سے باز آنے والے ہو۔

بیگانہ عورتوں پر نگاہ ڈالنے سے اجتناب برتنے کے بارے میں کہتا ہے:

"ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ" (سورہ نور آیت ۳۰) یہ عمل ان کی پاکدامنی کی حفاظت کے لیے مؤثر ہے۔

مشرکوں کے مسجد الحرام میں داخلے کی ممانعت کے بارے میں فرماتا ہے:

"إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ" (سورہ توبہ آیت ۲۸)

مشرک نجس ہیں لہٰذا انہیں مسجد الحرام میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔

اور "فئ" (بیت المال کے اموال کے ایک حصے) کو بیت المال سے مخصوص کرنے اور اسے عامۃ الناس کی ضروریات پر خرچ کرنے کے بارے میں فرماتا ہے:

"کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ" (سورہ حشر آیت ۷)

نے اس دولت کو پیغمبرؐ اور بیت المال کے عمومی مصارف کے لیے مخصوص کیا ہے تاکہ یہ دولت سمیٹنے والوں اور سرمایہ داروں کے درمیان گردش نہ کرتی رہے اور عوام اس سے محروم نہ رہ جائیں۔

اسی طرح اور بہت سے احکام کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے جن کا ذکر کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی احادیث میں بھی ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جبکہ پیشوایانِ اسلام نے خود پہل کرکے یا لوگوں کے دریافت کرنے کے بعد احکام کا فلسفہ اور اسرار بیان فرمائے ہیں۔ محدثِ بزرگ شیخ صدوق علیہ الرحمہ کی تالیف کردہ مشہور کتاب علل الشرائع ـــــ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے ـــــ ایسی ہی احادیث وغیرہ کا مجموعہ ہے۔

لہٰذا جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور پیشوایانِ اسلام بہت سے مواقع پر احکام کا فلسفہ اور اسرار بیان فرماتے ہیں تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انھوں نے ہمیں اس بارے میں بحث کرنے کا حق دیا ہے۔ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی تو ضروری تھا کہ وہ ہمیں احکام کے بارے میں غور وخوض اور چھان بین سے صریحاً منع فرمادیتے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دینی مسائل کے استنباط کی عام طرز اور ان سب کے بارے میں بابِ استدلال کی کشودگی اور اسی طرح احکام کے اسرار و رموز کے متعلق مسلمانوں، اصحابِ رسولؐ اور ائمہ اہلبیتؑ کے ادراک اور روش نے یہ حق ہمارے لیے محفوظ کردیا ہے۔

اگر یہ خیال کیا جائے کہ احکام کا فلسفہ بیان کرنے سے ممکن ہے کہ ان کی اہمیت، قطعیت اور عمومیت میں کمی واقع ہوجائے تو اس انداز میں سوچنا غلط ہے بلکہ اس کے

برعکس اس قسم کا تذکرہ انسان کی عقل اور روح کو سیر کر کے احکام کو اس کی زندگی میں داخل کرتا ہے اور انہیں اس کی زندگی کا جزو بنا دیتا ہے۔ اس صورت میں انسان احکام کا استقبال روکھی پھیکی اطاعت کے طور پر نہیں بلکہ ایک جانی پہچانی حقیقت کی حیثیت سے کرتا ہے۔ یہ تھا مسئلے کا ایک پہلو۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری معلومات میں خواہ کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے پھر بھی وہ محدود ہی رہتی ہیں۔ ہم تمام چیزوں کے بارے میں نہیں جانتے۔ اگر جانتے ہوتے تو انسان کا قافلۂ علم فوراً رک جاتا کیونکہ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا ہوتا۔ یہ ہماری نادانیاں ہی ہیں جو دانشمند انسانوں کو دریافت نہ کی گئی چیزوں کو دریافت کرنے اور ڈھکی چھپی چیزوں کو ظاہر کرنے کی مسلسل کوشش اور تلاش میں مصروف رکھتی ہیں۔

بلکہ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں جو ہم نہیں جانتے سمندر کے مقابلے میں ایک قطرے یا ایک بہت ہی بڑی کتاب کی ایک سطر کے برابر ہے حتیٰ کہ جو کچھ ہم نہیں جانتے اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی تشریح کے لیے ہماری دنیا کے علاوہ کسی اور دنیا سے بھی ایک استاد لایا جائے تو ہم انہیں سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کہ اگر دورِ حاضر کے سائنسی مسائل آج سے ہزار سال پہلے دنیا میں بسنے والے لوگوں کو سمجھائے جاتے تو وہ انہیں ہرگز نہ سمجھ سکتے چہ جائیکہ وہ خود اپنی سوچ بچار اور عقل سے ان کی تہہ تک پہنچ جاتے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آسمانی احکامات کا سرچشمہ خدائے علیم کا لامحدود علم ہے۔ وہ ایک ایسا مبداء ہے جس کے سامنے ہستی کے تمام حقائق روشن ہیں اور جس کے لیے ماضی و مستقبل اور غیب و شہود کا کوئی مفہوم نہیں بلکہ وہ ہر چیز سے یکساں طور پر آگاہ ہے۔

ان حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ تمام احکام کا فلسفہ سمجھ سکیں؟ اگر یہ صورت ہوتی تو احکامِ شریعت کے سلسلے میں ہمیں پیغمبروں کی کیا ضرورت تھی؟ ہم خود بیٹھ جاتے، جو چیز صحیح اور قرینِ مصلحت سمجھتے اس کی توثیق کر دیتے اور زندگی کے ان سنگلاخ بیابانوں میں نہ بھٹکتے پھرتے۔

اس کے علاوہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم آفرینش اور دنیا کی تمام موجودات اور ان پر حکومت کرنے والے قوانین اور ان میں سے ہر ایک کے وجود کے فلسفے سے واقف ہیں؟

شرعی احکام بھی آفرینش کے حقائق سے الگ نہیں ہیں اور ہمارا علم ان دونوں کے بارے میں محدود ہے۔

اس بحث سے مجموعی طور پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

ہر عصر اور ہر زمانے میں فقط انسانی معلومات کے اندازے اور معیار کے مطابق احکام الٰہی کا فلسفہ اور اسرار سمجھے جا سکتے ہیں اور اصولاً ہمیں چاہیے کہ ان احکام کی گہرائی اور وسعت اور خود اپنے علم کی محدودیت کے پیش نظر اس سے زیادہ کی توقع بھی نہ رکھیں۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم ان احکام کی اطاعت کو ان کے پس پشت فلسفے کی سوجھ بوجھ سے ہرگز مشروط نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم خود اپنے لیے لامحدود علم کا دعوےٰ کرتے ہیں اور اپنی عقل کو خدا کی عقل کی حدود میں لا کھڑا کرتے ہیں اور یہ بات کسی حالت میں بھی معقولیت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔

مختصر یہ کہ احکام کے فلسفے اور اسرار کے بارے میں بحث اور یہ بحث کرنے کا حق ایک چیز ہے اور ان احکام کی اطاعت ایک بالکل دوسری چیز ہے اور دوسری چیز نہ کبھی پہلی چیز سے مشروط رہی ہے اور نہ ہے۔

ہم احکام الٰہی کے فلسفے کے بارے میں اس لیے بحث کر رہے ہیں تاکہ ان کی افادیت، اہمیت اور مختلف اثرات کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کر سکیں۔ یہ بحث اس لیے نہیں ہو رہی کہ ہم دیکھیں آیا ان احکام پر عمل کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے۔

یہ مسئلہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ ہم اپنے معالج سے جو ایک طبیبِ حاذق ہو اس دوائی کے فوائد اور تاثیر کے بارے میں وضاحت طلب کریں جو اس نے ہمارے لیے تجویز کی ہو تاکہ اس کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کر سکیں اور اس لیے نہیں کہ اس کی ہدایات پر عمل کرنا اس کی تسلی بخش توضیحات سے مشروط ہو کیونکہ اس صورت میں ضروری ہوگا کہ ہم خود بھی طبیب ہوں۔

اس نکتے کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ احکام کے اسرار و رموز کے بارے میں بحث اور غور و فکر کا یہ مقصد نہیں کہ زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے جائیں اور مذہب کے بلند پایہ احکام و ضوابط کے بارے میں محض تخیّل، قیاس اور گمان پر مبنی فلسفہ بگھارا جائے مثلاً کہا جائے کہ اذان صوتی تاروں کی تقویت کا ذریعہ ہے، نماز ایک قسم کی سویڈش Swedish ورزش ہے اور روزے کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان دُبلا ہو جائے۔ حج عرب کے صحرا نشینوں کی مالی امداد کا ذریعہ ہے اور رکوع اور سجود فقط ریڑھ کی ہڈی کی حفاظت اور عرق النسا کی پیش بندی کے طریقے ہیں۔

نہیں ــــ احکام کے بارے میں بحث کا یہ مقصد ہرگز نہیں کیونکہ یہ مضحکہ خیز قیاس آرائیاں نہ صرف یہ کہ انسانوں کو احکام کی جانب راغب نہیں کرتیں بلکہ ان کی قدر و قیمت گھٹانے اور انہیں نامعتبر ظاہر کرنے کا بہت بڑا ذریعہ بنتی ہیں۔

فلسفۂ احکام کے بارے میں غور و فکر کیسے کیا جائے ؟

اسلام کے احکام ان کے اسرار و رموز پر غور و فکر کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں بلکہ انہیں چار مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ قرآن مجید کی منطق اور پیشوایانِ اسلام کی روش اس امر پر شاہد ہیں کہ ہر مسلمان یہ حق رکھتا ہے کہ احکام کے اسرار اور فلسفہ کے بارے میں بحث اور غور و فکر کرے تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کسی ضابطے اور معیار کے بغیر جو جی میں آئے کہہ دیں اور ہر شخص جو چیز سوچے اسے حکم کے فلسفے کا نام دے کر دہراتا پھرے کیونکہ بیجا طور پر فلسفہ بگھارنا اتنا ہی نقصان دہ، خطرناک اور غیر منطقی ہے جتنا کہ زبردستی کی روکھی پھیکی اطاعت کرانا اور سوال وجواب سے منع کرنا۔

لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس بحث کا آغاز اور پیروی کس انداز سے، کن حدود کے اندر اور کن خطوط کے مطابق کریں ؟ سب سے پہلے اس نکتے کا یاد دلانا ضروری ہے کہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں نہ تو دینی احکام اور قوانین پر عملدرآمد خدا کے جلال اور کبریائی میں کوئی اضافہ کرتا ہے اور نہ ہی ان کی مخالفت اس کی عظمت اور رتبے میں کوئی کمی پیدا

کرتی ہے جیسا کہ امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لا تضره معصية من عصاه ولا تنفعه طاعة من اطاعه"

یعنی نہ گناہگاروں کے گناہ اسے کوئی نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ فرمانبرداروں کی اطاعت اسے کوئی فائدہ پہنچاتی ہے۔

وہ ہستی کا بحرِ بے کراں ہے۔ ہمارے اور دوسری مخلوق کے پاس جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ نہ تو اسے کسی چیز کی کمی ہے تاکہ ہم وہ اسے فراہم کرسکیں اور نہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو اس کے پاس نہ ہو تاکہ ہم وہ اسے دے سکیں۔ جو کچھ ہمیں ملتا ہے اسی سے ملتا ہے اور وہ جتنا مناسب سمجھتا ہے ہمیں دیتا ہے اس کا اصلی خزانہ اسی کے پاس ہے

"وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" (سورہ حجر آیت ۲۱)

کیا پانی کا ایک قطرہ جو اپنا سرمایہ ایک بیکراں سمندر سے حاصل کرے کوئی چیز سمندر کو دے سکتا ہے؟ کیا ایک چھوٹا سا آئینہ جو سورج کے سامنے رکھا ہو سورج کو روشنی بخش سکتا ہے؟ ہم تمام انسان خواہ کتنی ہی قدرت کیوں نہ رکھتے ہوں ہماری حیثیت اس قطرے یا اس آئینے کی سی ہے۔

لہٰذا اگر ان احکامات میں کوئی فائدہ اور نتیجہ مضمر ہے تو وہ ہم ہی سے مخصوص اور مربوط ہے۔

ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہم نہ تو فقط جسم ہیں تاکہ جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ جسم کی تربیت اور پرورش اور حفظانِ صحت کے لیے ہو اور نہ ہی صرف روح ہیں کہ تمام احکام ان کی معنوی تاثیر کی خاطر نافذ کیے جائیں بلکہ ہم جسم اور روح کا مجموعہ ہیں اور قدرتی طور پر ہمارے آسمانی احکام بھی دونوں پہلوؤں کی تکمیل کے لیے ہیں اور مادہ اور روح پر محیط ہیں۔

لہٰذا وہ لوگ بھی گمراہ ہیں جو اسلام کے احکام میں فقط طبّی اور حفظانِ صحت کے فوائد یا اقتصادی منفعتوں کی تلاش میں ہیں اور نمازوں، دعاؤں اور خدا سے راز و نیاز

تک کو فقط ان کے مفید روحانی اور جسمانی اثرات کی خاطر انجام دیتے ہیں اور انہیں روحانی دکھوں، تکالیف اور پریشانیوں کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد تلاش نہیں کرتے اور وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں جو پاک صاف لباس پہننے، ناخن کاٹنے، مکڑی کے جالے دُور کرنے اور ٹوٹے ہوئے گلاس سے پانی نہ پینے اور جس پانی سے کسی شخص نے خود یا کسی دوسرے نے غسل کیا ہو اس سے پرہیز کرنے جیسی ہدایات کو بھی ان مخصوص اخلاقی، معنوی اور روحانی اثرات سے مربوط سمجھتے ہیں جن پر سے علم و دانش نے ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے کچھ احکام اخلاق کی پرورش اور روح کی کاملیت کے لیے اور کچھ مادی زندگی کے نظم و نسق کے لیے جاری کیے گئے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر دونوں پہلو رکھتے ہیں۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ احکام کے اسرار اور فلسفے کی چھان بین کس ضابطے کے تحت انجام پانی چاہیے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ دینی احکام بحیثیت مجموعی چار حصّوں میں منقسم ہیں:

(ا) وہ احکام جن کا فلسفہ رسولِ اکرمؐ کی بعثت کی ابتداء سے ہی سب پر واضح ہو گیا تھا اور لوگ اپنی سوجھ بوجھ اور معلومات کی مناسبت سے ہر چیز کو سمجھتے تھے اور لوگوں کو عام طور پر ان کی انجام دہی کا پابند بنانے کے لیے انہیں قانونی شکل دے دی گئی مثلاً جھوٹ، خیانت، تہمت، قتلِ انسانی، چوری، ظلم و ستم، کم فروشی اور دھوکا بازی کا حرام ہونا یا عدل و انصاف، پاکیزگی، دیانتداری، مظلوموں کی امداد، محنت اور والدین، اقربا اور ہمسایوں سے بھلائی کے احکام وغیرہ کیونکہ ہر شخص خواہ اس کی معلومات کسی درجے کی ہوں ان احکام کا مقصد اور فلسفہ سمجھ سکتا ہے۔ گو جوں جوں زندگی کے مسائل کے بارے میں انسان کی عقل اور آگاہی بڑھتی ہے وہ ان احکام کی اہمیت کا ادراک بہتر طور پر کر سکتا ہے۔

(ب) وہ احکام جن کا فلسفہ اس زمانے کے عوام اور بعض اوقات دانشمندوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا اور قرآن مجید کے متن اور ائمہ اہلبیتؑ کے اقوال میں ان کے اسرار و رموز کی

جانب اشارے کیے گئے ہیں مثلاً شاید اس زمانے کے لوگ روزے کے سہ گانہ (اخلاقی، معاشرتی اور طبّی) فلسفے سے بے خبر تھے لہٰذا ایک مقام پر قرآن مجید نے اس کی تربیتی اور اخلاقی تاثیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" (سورۂ بقرہ آیت ۱۸۳)

ایک اور جگہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کی اجتماعی تاثیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"یستوی بہ الفقیر والغنی"

... تاکہ دولتمند اور حاجتمند یکساں زندگی بسر کریں اور یہ بھوکوں کی حالت سے واقف ہو جائیں اور ان کی مدد کی کوشش کریں۔

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں: "صوموا تصحوا"

یعنی روزہ رکھو تاکہ تمہارا بدن صحت مند ہو جائے (اور غیر استعمال شدہ فالتو مواد اور تعفّن پیدا کرنے والی تولید جل کر معدوم ہو جائے)۔

ایسے ہی بہت سے اور احکام ہیں جن کے اسرار کی جانب آیاتِ قرآنی، رسولِ اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ کی احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں شیخ صدوق نے ایسی احادیث جمع کرکے علل الشرائع نامی کتاب بھی لکھی ہے اور مشہور محدث شیخ حر عاملی نے اپنی کتاب وسائل الشیعہ میں ہر فصل کے شروع میں عموماً ایک باب میں احکام کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ ان اسرار اور فوائد کا ذکر لوگوں کی سوجھ بوجھ کی سطح کی مناسبت سے کیا گیا ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک حکم کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا فلسفہ اسی تک محدود ہے اور نہ ہی اس کے یہ معنی ہیں کہ بیشتر ادراک حاصل کرنے کے لیے سوچ بچار کی ممانعت ہے۔

(ج) وہ احکام جن کے اسرار پر سے وقت گزرنے اور انسان کی علمی ترقی کے ساتھ ساتھ پردہ ہٹ گیا ہے اور ان کا چہرہ نمایاں ہو گیا ہے اور ہم انہیں ان آسمانی احکام کی عظمت اور سچائی کی زندہ دلیل سمجھ سکتے ہیں۔

مثلاً الکحل سے تیار کردہ مشروبات کے جسمانی، روحانی اور معاشرتی مضر اثرات حتیٰ کہ ان کا عورتوں اور جنین پر اثر انداز ہونا جس کے متعلق آج کل کے اعداد و شمار کی زبانی سنا جاسکتا ہے یا جوئے کے کھیلوں کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اعصابی ہیجانات اور ان کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والی اموات یا وہ خطرات جو دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے معاشرے کو لاحق ہوجاتے ہیں یا سود خواری کے ناقابل انکار اقتصادی اور اخلاقی نقصانات جنہیں ریاضی کے ہندسوں کی شکل میں کاغذ پر لکھا جاسکتا ہے یا گندی غذاؤں، پانی اور مکانوں کی خرابیاں جن کے استعمال کی اسلام میں بڑی سختی سے ممانعت کی گئی ہے اور جن خرابیوں نے جراثیم اور وائرس کے پھیلنے پھولنے کے بعد بڑی واضح شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ تمام احکام ایسے ہیں جن کے فلسفے پر سے وقت گزرنے اور انسانی سوچ بچار کی سطح بلند ہونے سے پردہ اٹھ گیا ہے اور اب ہم انہیں بالکل واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

لیکن ایک موضوع کی جانب توجہ دینا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہر قسم کی افراط، معقولیت کی حدود سے تجاوز، غلط تخمینے، کوتاہ نظری، خام بصیرت اور سب سے بڑھ کر غیر ثابت شدہ علمی مفروضوں کو مسلّمہ علمی قوانین کا درجہ دینا ہمیں حقیقت سے کوسوں دور کردیتا ہے اور احکام کے فلسفے اور اسرار سے روشناس کرانے کی بجائے ایک غلط راستے پر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے لہٰذا جب تک علم کسی چیز کو قطعی اور مسلّم طور پر ثابت نہ کردے اور وہ چیز ایک واضح صورت اختیار نہ کرلے کسی حکم کے فلسفہ کی وضاحت کے سلسلے میں اسے بحث کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔

جب ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو تو ہمیں کسی حکم کا فلسفہ بیان کرنے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے اور اگر کچھ کہنے کے لیے ہو بھی تو ہمیں یہ کہہ کر ہرگز پیش نہیں کرنا چاہیے کہ کسی حکم کا فلسفہ اسی پر منحصر اور اسی تک محدود ہے۔

(د) آخری قسم کے احکام وہ ہیں جو نہ تو شروع میں روشن اور واضح تھے اور نہ اسلامی کتابوں میں ان کے اسرار کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور نہ ہی وقت گزرنے کے ساتھ

(اب تک) ہمیں ان پر دسترس حاصل ہو سکی ہے۔ نماز کی رکعتوں کی تعداد، جن لوازمات پر زکات دینی واجب ہے ان کے نصاب کی حد یا حج کے بعض مناسک ایسے امور ہیں جو اس زمرے میں آتے ہیں۔

کیا بعد میں آنے والے لوگوں کو چاہیے کہ علم و دانش کی جدید پیشرفت کے ذریعے ان اسرار پر سے پردہ ہٹا دیں؟

کیا رسولِ اکرمؐ کے آخری وصی اس کام پر مامور ہیں کہ ان امور کی توضیح اور تفسیر کریں؟

کیا یہ امور انضباطی پہلو رکھتے ہیں؟

اور کیا یہ ان اسرار میں سے ہیں جن کے فلسفے کا عقلِ انسانی آئندہ بھی مکمل طور پر ادراک نہ کر سکے؟.....

ان سب باتوں کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ چوتھی قسم کے احکام بھی ہمارے لیے اتنے ہی قابلِ احترام ہیں اور ان کا اجرا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا پہلی تین اقسام کے احکام کا ہے کیونکہ ان سب احکام کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور جو رسولِ ختمی مرتبتؐ انہیں لائے ہیں ان کا مامور بہ رسالت ہونا ہم پر قطعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے۔

دینی مسائل میں تقلید کیوں کی جائے؟

انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو اسے کسی چیز کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہوتا لہٰذا اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کے تجربات سے بہرہ مند ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کا پرپیچ راستا طے کرنے کے لیے اسے ہر قدم پر علم و دانش کی شدید ضرورت پڑتی ہے۔

بنیادی طور پر زندگی دو مضبوط اور محکم ستونوں پر قائم ہے اور وہ دو ستون جاننا اور کام میں لانا ہیں اور چونکہ کام میں لانے کے لیے بھی جاننے کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا زندگی کا پہلا قدم جاننے سے شروع ہوتا ہے۔

یہی وہ مرحلہ ہے جس پر انسان کی ایک جبلت اس کی مدد کرتی ہے اور زندگی، کمال اور سعادت کی راہیں اس کے لیے کھول دیتی ہے۔ اس جبلت کو اقتباس اور تقلید کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں بچہ اسی اندرونی تحریک یعنی تقلید کی بدولت آہستہ آہستہ ماں باپ سے باتیں کرنا اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب سیکھتا ہے اور ہر روز زندگی کے مراحل میں سے ایک مرحلہ طے کرتا ہے اور جوں جوں بڑا ہوتا ہے دوسروں کے علوم و افکار

سیکھنے اور ان کی پیروی کرنے پر توجہ دینے لگتا ہے حتی کہ رفتہ رفتہ اس دنیا کی موجودات سے آشنا ہو جاتا ہے اور اپنے فرائض انجام دینے لگتا ہے۔

لیکن یہاں ایک بنیادی نکتے کی جانب توجہ دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کے خیالات اور طور طریقوں کی پوری پوری تقلید اور پیروی کرنا درست نہیں بلکہ تقلید کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

۱ــــ جاہل کا جاہل کی تقلید کرنا

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس قسم کی تقلید نہ صرف یہ کہ انسان کی زندگی کو خوشگوار نہیں بناتی بلکہ اسے بدبختی کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جو دوسروں کے اخلاق اور طور طریقوں کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی مختلف رسوم مثلاً لباس پہننے، کھانا کھانے اپنے بچوں کے نام رکھنے اور ایسی ہی دوسری باتوں میں لوگوں کی نقل اتارنے کے علاوہ ناجائز باتوں کی اشاعت اور عقیدے اور اخلاق کی طرز کے سلسلے میں بھی مختلف دلکش عنوانوں کے تحت بلا سوچے سمجھے ان کی تقلید کرتے ہیں حالانکہ اس قسم کی تقلید کی خرابیاں بالکل واضح ہیں۔ اسی قسم کی تقلید کے بارے میں کہا گیا ہے۔

خلق را تقلید شان برباد داد
ای دو صد لعنت برایں تقلید باد

جاہلوں کی تقلید نے لوگوں کو برباد کر دیا ہے۔ ایسی تقلید پر دو سو مرتبہ لعنت ہو

قرآن مجید میں بھی اس قسم کی تقلید کی مذمت میں آیات نازل ہوئی ہیں مثلاً بت پرست، پیغمبروں کے اعتراض کے جواب میں کہتے تھے:

"اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ"

(سورۂ زخرف آیت ۲۲)

ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اس روش پر پایا اور ہم انہیں کی پیروی کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس منطق کو بڑی سختی سے رد کیا ہے اور ان لوگوں کو سرزنش کی ہے۔

۲ — عالم کا جاہل کی تقلید کرنا

یہ امر واضح ہے کہ ایسی تقلید پہلی قسم کی تقلید سے بھی بدتر اور زیادہ خطرناک ہے کیونکہ ایک عالم شخص کو چاہیے کہ اپنے علم و دانش کی روشنی میں قدم اٹھائے تاکہ اپنی ذمہ داری کے مطابق عمل کرے۔ بدترین قسم کی تقلید یہ ہے کہ ایک دانا شخص اپنی معلومات سے فائدہ نہ اٹھائے اور زندگی کے معاملات میں دوسروں کی اندھا دھند پیروی کرے۔

۳ — عالم کا عالم کی تقلید کرنا

ایک عالم جس میدان میں ماہر اور صاحب نظر ہو اس میں اسے مستقل طور پر اپنے ہم پایہ عالم کی تقلید نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنی بصیرت کے مطابق عمل کرنا چاہیے لہذا فقہا کہتے ہیں کہ جو شخص اجتہاد کے رتبے پر پہنچ جائے اُسے اپنے اجتہاد پر عمل کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اجتہاد کے اجازت ناموں میں عموماً لکھا جاتا ہے:

"یحرم علیہ التقلید"

یعنی تقلید کرنا اس پر حرام ہے

اور اسے چاہیے کہ اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرے البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ علمی مسائل کے بارے میں دوسرے دانشمندوں سے مشورہ اور تبادلہ خیال کرلے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک عالم کو چاہیے کہ ایک فیصلہ اپناتے وقت اپنی آزادانہ رائے کی حفاظت کرے اور مطالعہ کیے بغیر دوسروں کے نظریات قبول نہ کرے۔

۴ — جاہل کا عالم کی تقلید کرنا

اس قسم کی تقلید کو عقلِ سلیم اور فطرت لازم و لابُد قرار دیتی ہے اور اس کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ اسی منطق اور فطرت کا نتیجہ ہے کہ ہم عمارت تعمیر کرنے کے لیے معمار کو اور لباس سلوانے کے لیے درزی کو تلاش کرتے ہیں اور جب بیمار ہوں تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں المختصر عقل اور فطرت ہر کام میں ہمیں اس کام کے جاننے والے اور ماہر کیجانب رجوع کرنے کو کہتی ہے۔

یہی منطق ہے جو دینی تعلیمات اور قوانین الٰہی کے سلسلے میں لوگوں کو فقہاء کی پیروی پر آمادہ کرتی ہے جو احکام الٰہی کو سمجھنے کی مہارت رکھتے ہیں ——— وہ فقہاء جو سالہا سال تک اپنی غیر معمولی استعداد کے ساتھ علم و دانش کے راستے پر چلے ہیں حتیٰ کہ اجتہاد کی بلندی پر جا پہنچے ہیں یعنی اس بات کی اہلیت رکھتے ہیں کہ قوانین الٰہی کو ان کے اصلی مدارک سے استخراج اور استنباط کر کے لوگوں تک پہنچا دیں ——— وہ فقہاء جو لوگوں کے دینی رہبر اور راہنما ہیں اور انہیں یہ عظیم منصب اسلام کے بزرگ پیشواؤں کی جانب سے عطا ہوا ہے تاکہ تمام دینی شعبوں میں لوگوں کی رہنمائی خوش بختی کی جانب کریں۔

یہاں اس نکتے سے غفلت نہیں برتنی چاہیے کہ انسانی علوم کی متعدد اصناف ہیں اور ممکن ہے کہ ایک شخص ایک صنفِ علم میں تو غیر معمولی مہارت رکھتا ہو لیکن دوسری صنف سے قطعاً نابلد ہو اور نتیجتاً اس کے لیے ضروری ہو کہ جس کام کے متعلق وہ کچھ نہ جانتا ہو اس کے لیے متعلقہ ماہرین سے رجوع کرے اور جو کچھ وہ کہیں اس کی پیروی کرے۔

مثلاً ایک ڈاکٹر یا انجینئر جو اپنے کام میں پوری پوری مہارت رکھتا ہو ایک شہر میں وارد ہو اور شہر کی ایک سڑک پر واقع ایک مخصوص کوچے میں جانا چاہے جس سے وہ پہلے سے واقف نہ ہو لیکن اس کا پتا اس کو دے دیا گیا ہو۔ اس صورت میں اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے مجبوراً ایسے لوگوں سے دریافت کرنا پڑے گا جو اس علاقے

کو جانتے ہوں۔

یا مثلاً اگر فضائی علوم کا ایک ماہر بیمار پڑ جائے تو اسے مجبوراً بدن کے ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا۔ گو یہ شخص فضائی علوم کا ماہر ہے لیکن بیماریوں اور علاج کے طور طریقوں سے واقف نہیں لہٰذا اس کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ڈاکٹر سے رجوع کرے اور جب ڈاکٹر کوئی مخصوص گولیاں کھانے یا انجکشن لگوانے کو کہتا ہے تو فضائی علوم کا ماہر بلاچون وچرا اس کی ہدایت کی پیروی کرتا ہے اور اس سے یہ ہرگز نہیں پوچھتا کہ اس نے یہ دوائیں کیوں تجویز کی ہیں۔

ان دو مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ سب لوگوں کو ـــــ خواہ وہ اپنے کاموں میں ماہر ہی کیوں نہ ہوں ـــــ ایک مجتہد کے کہے کی پیروی کیوں کرنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک فقیہ بھی اپنے میدانِ عمل کا ماہر ہے۔ وہ کئی ایک ایسی اصنافِ علم کا ماہر ہے جو اجتہاد اور فقاہت کی بنیاد ہیں (صرف، نحو، لغت، کلام، منطق، تفسیر، رجال، درایہ، حدیث اور اصولِ فقہ)۔

آپ حضرات توضیح المسائل نامی ایک چھوٹا سا رسالۂ عملیہ دیکھتے ہیں اور شاید یہ نہیں جانتے کہ یہ رسالہ ایک فقیہ کی تمام عمر کا حاصل ہے جو اس نے طاقت فرسا مشقت اٹھا کر اور خونِ دل صرف کر کے تیار کیا ہے اور لوگوں کی دسترس میں دیا ہے۔ اجتہاد کوئی آسان کام نہیں۔ اجتہاد سے مراد ان سب قوانینِ الٰہی کا علم حاصل کرنا ہے جو فرد اور معاشرے کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر براہِ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔

شیخ مرتضٰی انصاری جو ایک بلند رتبہ مجتہد اور مکتبِ اسلام کے قابلِ فخر فرزند ہیں اور جنہوں نے اجتہاد کا پرپیچ راستہ عبور کیا ہے اپنی کتاب رسائل میں کہتے ہیں:

"رزقنا اللّٰه الاجتهاد الذی هو اشد من طول الجهاد"

یعنی اللہ نے ہمیں اجتہاد کی توفیق عطا کی، وہ اجتہاد جو مسلسل جہاد سے زیادہ بھاری اور زیادہ تکلیف دہ ہے۔

اس نکتے کا بیان کرنا ضروری ہے کہ مجتہدوں کے احکام کی پیروی اسلام کے

اعتقادی اور اصولی مسائل سے نہیں بلکہ فروعی (عملی) احکام سے مخصوص ہے۔ دوسرے لفظوں میں مجتہد کی تقلید اور پیروی فروعِ دین میں کرنی ہوتی ہے نہ کہ اصولِ دین میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصولی مسائل مثلاً اللہ تعالٰی اور انبیائے کرامؑ کی پہچان دین کی اصل اور بنیاد شمار ہوتے ہیں اور ان کا دلیل اور منطق کی رو سے جاننا قطعاً ضروری ہے۔ تاہم ان اصولوں کو دلیل اور منطق کی رو سے قبول کرنے کے بعد فروعی احکام کے لیے (جن کے دینی منابع مثلاً قرآن مجید، حدیث اور دوسرے دلائل سے سمجھنے کے لیے مختلف علوم کے جاننے اور ان میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے) مجتہدوں سے رجوع کیا جا سکتا ہے جو ان مسائل کے ماہرینِ خصوصی ہیں۔

علاوہ ازیں اسلام کے قطعی اور مسلمہ مسائل مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا واجب ہونا۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جھوٹ، خیانت، غیبت، شراب اور جوئے وغیرہ کے حرام ہونے کے بارے میں ان کی پیروی کا کوئی سوال نہیں کیونکہ یہ مسائل سبھی جانتے ہیں اور ان کے لیے تقلید کی ضرورت نہیں لہٰذا تقلید غیر قطعی فرعی احکام تک محدود ہے۔

ہم اللہ کی عبادت کیوں کریں؟
نماز، روزہ اور حج کا فلسفہ کیا ہے؟

سوال: جب اللہ کو کسی کی پرستش کی ضرورت نہیں تو ہم اس کی عبادت کیوں کریں؟ وہ سب سے بے نیاز ہے اور سبھی اس کے محتاج ہیں۔ اگر اللہ ہماری عبادتوں کا محتاج ہو تو یہ بات اس کے الوہیت کے رتبے سے سازگار نہیں۔

جواب: اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے ـــــ ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔

اجمالی جواب یہ ہے کہ جب عبادت کا مقصد یہ ہو کہ ہم اللہ کی ضروریات پوری کریں اور اس کی پرستش کر کے اسے کوئی فائدہ پہنچائیں تو اس صورت میں مذکورہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ ایک لامحدود اور لامتناہی وجود ہے اور ہر قسم کے نقص اور ضرورت سے مبرا ہے لہذا اسے ہماری پرستش کی کیا ضرورت ہے لیکن جب اس کی پرستش کرنے کا مقصد خود ہمارا ارتقا ہو تو اس وقت عبادت ہمارے ارتقا اور خوش بختی کا وسیلہ ہو گی اور اس ذاتِ اقدس کی جانب سے عبادت کا حکم ہمیں موزوں کمال تک پہنچانے کے لیے ایک قسم کی عنایت،

لطف اور رہنمائی ہو گی۔

اور اب ذیل میں اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جاتا ہے:

عبادت، دعا اور ہر وہ کام جو اللہ کی خوشنودی کے لیے انجام دیا جائے بیش قیمت انفرادی اور اجتماعی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ عالی ترین تربیتی اور اخلاقی مکاتب میں سے ہے کیونکہ:

۱- اللہ کی عبادت انسان میں قدردانی اور شکرگزاری کی حس کو زندہ کرتی ہے جس مقام سے انسان کو عظیم اور بیش قیمت نعمتیں عطا ہوں، اس کی قدر کرنا اس کے ان مہربانیوں کے لائق ہونے کی نشانی ہے جو اس پر کی جائیں۔

ذاتِ خداوندی کے شکر اور سپاس گزاری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ سپاس گزار انسان شکر ادا کرکے اور وظیفہ بندگی انجام دے کر اپنے آپ کو ان نعمتوں کی نسبت سے آشکار کر دیتا ہے جو اس کو عطا کی جاتی ہیں۔

۲- اللہ کی عبادت انسان کے روحانی ارتقاء کا موجب ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ارتقا ہو سکتا ہے کہ ہماری روح کمالِ مطلق کے جہانِ بیکراں یعنی اللہ سے مربوط ہو جائے اور بندگی کے وظائف اور زندگی کے کاربار انجام دینے کے لیے اس کی لامتناہی قدرت اور لامحدود قوت سے مدد طلب کرے اور اتنی شائستگی اور لیاقت حاصل کر لے کہ اس سے گفتگو کر سکے۔

یہ فوائد جن کا ذکر مختصر طور پر کیا گیا ہے ان تمام عبادات میں موجود ہوتے ہیں جو صحیح طور پر انجام پائیں اور ساتھ ہی ساتھ نماز، روزہ اور حج وغیرہ جیسی عبادات میں سے ہر ایک عبادت اپنا مخصوص اثر اور فائدہ رکھتی ہے۔ ہم نمونے کے طور پر ان تین سب سے بڑی اسلامی عبادات کے کچھ اسرار کی جانب مختصراً اشارہ کرتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ دعاؤں اور عبادات کا فائدہ ہمیں پہنچتا ہے اور اللہ کو ان کی کوئی حاجت نہیں۔

۱ــــ نماز اور اس کے تربیتی اسرار

نماز اللہ کی یاد کا موجب ہے اور اللہ کی یاد ضبطِ نفس، سرکش خواہشات کو کنٹرول کرنے اور باغی روح پر قابو پانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

نمازی ہمیشہ خدا کی یاد میں رہتا ہے۔ اسی خدا کی یاد میں جو ہمارے چھوٹے اور بڑے تمام کاموں سے واقف ہے اور جو چیز بھی ہماری روح کے گوشوں میں وجود رکھتی ہے یا ہمارے خیال سے گزرتی ہے اس سے مطلع اور باخبر ہے۔ خدا کی یاد کا کم از کم یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ انسان کی خودسری اور ہوا و ہوس کو اعتدال بخشتی ہے۔ جیسا کہ خدا سے غفلت اور اس کی مقرر کردہ جزا و سزا سے لاعلمی عقل کی تاریکی کا موجب بنتی ہے۔

جو انسان خدا سے غافل ہو وہ اپنے اعمال اور کردار کے نتائج کے بارے میں نہیں سوچتا اور اپنی سرکش خواہشات اور میلانات کی تکمیل کے لیے کوئی حد نہیں پہچانتا۔ یہ نماز ہی ہے جو ہمیں دن رات میں پانچ مرتبہ خدا کی یاد میں مشغول کرتی ہے اور ہماری روح پر سے غفلت کی سیاہی دھو ڈالتی ہے۔

بلاشبہ انسان کے لیے ــــ جس کے وجود میں فطری خواہشات کی حکومت کی بنیاد بڑی مضبوط ہے ــــ ان لامحدود خواہشات پر قابو پانے کا بہترین طریقہ خدا کی یاد اور گناہگاروں کی سزاؤں اور اس دقیق حساب کتاب کو یاد رکھنا ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ــــ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید خدا کی یاد کو نماز کے مقاصد میں سے ایک مقصد قرار دیتا ہے:

"اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ" (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۱۴)

"نماز کو میری یاد کے لیے قائم کرو۔"

۲ــــ گناہ سے دوری

نمازی کے لیے ضروری ہے کہ اپنی نماز کے صحیح اور قابلِ قبول ہونے کے لیے بہت سے گناہوں سے اجتناب برتے مثلاً نماز کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ اسکی بجا آوری

کے لیے جو وسائل (مثلاً وضو اور غسل کا پانی، لباس جس میں نماز پڑھی جائے اور نماز پڑھنے کی جگہ) کام میں لائے جائیں وہ جائز اور مباح ہوں۔ یہ بات اس امر کا موجب بنتی ہے کہ وہ حرام کے قریب نہ پھٹکے اور اپنے کاروبار میں ہر قسم کے حرام سے پرہیز کرے کیونکہ یہ چیز بہت مشکل ہے کہ ایک شخص فقط نماز سے متعلقہ امور کے بارے میں تو ان کے حلال ہونے کا پابند ہو اور دوسرے مواقع پر لاپروائی برتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل آیت اسی نکتے کی جانب اشارہ کرتی ہے اور فرماتی ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (سورہ عنکبوت آیت ۴۵)

"نماز برے اور قابلِ ملامت کاموں سے باز رکھتی ہے۔"

بالخصوص اگر نمازی یہ بات ذہن نشین کرے کہ خدا کی بارگاہ میں نماز کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ نمازی زکات اور حاجتمندوں کے حقوق ادا کرے، غیبت نہ کرے، تکبر اور حسد سے پرہیز کرے، الکحلی مشروبات سے اجتناب برتے اور توجہ، حضورِ قلب اور پاک نیت کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو تو اس صورت میں ایک حقیقی نمازی لازماً ان تمام امور کی رعایت کرے گا۔ انہیں وجوہ کی بنا پر ہمارے پیغمبر گرامیؐ نے فرمایا ہے کہ نماز صاف پانی کی ایک نہر کی مانند ہے جس میں انسان اپنے آپ کو دھوتا ہے۔ اگر کوئی شخص دن رات میں پانچ مرتبہ اپنے آپ کو پاک پانی سے دھوئے تو اس کا بدن ہرگز میلا اور گندہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو شخص دن رات میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرے اور اپنے قلب کو اس صاف روحانی چشمے میں دھوئے اس کے دل اور روح پر گناہ کی میل ہرگز نہیں جمتی۔

۳۔۔۔ پاکیزگی اور حفظانِ صحت

چونکہ نمازی بعض اوقات اپنا تمام بدن غسل کے طور پر دھوتا ہے اور حسب معمول دن رات میں کئی مرتبہ وضو کرتا ہے اور غسل اور وضو سے پہلے اپنا تمام بدن ہر قسم کی میل اور نجاست سے پاک کرتا ہے اس لیے وہ لازمی طور پر ایک صاف ستھرا

انسان ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے نماز حفظانِ صحت اور پاکیزگی کے سلسلے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جو کہ انسانی زندگی کے لیے ایک بڑی اہم چیز ہے۔

۴ — نظم وضبط

ہر اسلامی نماز کا ایک مخصوص اور معین وقت ہے اور ایک نمازی شخص کے لیے ضروری ہے کہ اپنی نمازیں انہیں مقررہ اوقات میں پڑھے لہٰذا یہ اسلامی عبادت نظم وضبط اور وقت شناسی کے سلسلے میں انسان کی مؤثر مدد کرتی ہے۔

بالخصوص چونکہ نمازی کے لیے فریضۂ صبح ادا کرنے کی خاطر طلوعِ آفتاب سے پہلے نیند سے جاگ اٹھنا ضروری ہے لہٰذا قدرتی طور پر ایسا شخص نہ صرف یہ کہ پاک صاف ہوا اور نسیم صبحگاہی سے استفادہ کرتا ہے بلکہ اسی موقع پر اپنی زندگی کے مثبت کاروبار کا آغاز بھی کرتا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے نماز کے انفرادی اور تربیتی اثرات اسی تک محدود نہیں ہیں تاہم یہ نمونہ اس بہت بڑی اسلامی عبادت کے عظیم اسرار کی نشاندہی کر سکتا ہے۔

۵ — اجتماعی اسرار

مقررہ اوقات میں نماز کی ادائیگی عظیم ملتِ اسلامیہ کی وحدت اور یک جہتی کا مظہر ہے کیونکہ مسلمان مخصوص اوقات میں رو بہ قبلہ کھڑے ہو کر خاص آداب کے ساتھ خداوندِ عالم کی پرستش کرتے ہیں یہ بجائے خود ایک ملت کے اتحاد اور یگانگت کا بہت بڑا نمونہ ہے کہ اسلام نے سب کو اس عبادت کے ذریعے متحد اور منظم کر دیا ہے۔

جب یہ نمازیں با جماعت ادا کی جائیں تو وحدت، اتحاد، مساوات اور برابری کی روح نمازیوں کی منظم اور مربوط صفوں سے مکمل طور پر نمایاں ہوتی ہے اور اس روحانی اتحاد اور یگانگت کی اہمیت کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔

اگرچہ نماز کے اجتماعی اور تربیتی فوائد کے اسرار انہیں تک محدود نہیں تاہم

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ اس فریضۂ الٰہی کی عظمت اور اہم اسرار کو واضح کر دیتا ہے۔

۶۔ روزے کے اسرار کی ایک جھلک

روزہ اسلامی عبادات میں سے ایک ہے۔ روزے کے تربیتی اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان پر سے عادت اور شہوت کی حکومت کو ختم کر دیتا ہے اور اسے نفسانی خواہشات کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔

حکومتوں میں سے سب سے زیادہ خطرناک اور بری حکومت خراب عادت کی حکومت اور نفس کی غلامی ہے کیونکہ اکثر تمباکو نوشی جیسی معمولی سی عادت انسان کی عزتِ نفس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے اور پھر دوسری عادتوں کا پوچھنا ہی کیا۔

آزاد انسان وہ ہے جس پر کسی قسم کی ناپسندیدہ عادت کی حکومت نہ ہو اور جو اپنے آہنی ارادے سے ایسی تمام عادتوں پر قابو پائے رکھے۔ اس طرح کی آزادی اور روحانی کمال کے لیے قوتِ مقابلہ اور ثابت قدمی کی ضرورت ہے جو صرف روزے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ روزہ انسانی جذبات کو بیدار کرتا ہے۔ ثروت مند اور کھاتے پیتے لوگ جو سال بھر انواع واقسام کے کھانوں سے پر دستر خوانوں پر بیٹھتے ہیں اور اس تمام مدت میں روزہ داروں کی طرح رات تک بھوکا رہنے والوں کی حالت سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہی لوگ جب روزہ رکھتے ہیں اور دن بھر بھوکے رہتے ہیں تو انہیں بھوکے پیاسے رہنے والے غریب افراد کا خیال آتا ہے اور وہ ان کے درد دل سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کی روح میں عظیم ترین انسانی جذبات کی کرن پھوٹتی ہے اور انہیں طبقاتی فاصلہ کم کرنے اور حاجتمند طبقے کی ضروریات پوری کرنے کا خیال آتا ہے۔ روزے کا اس سے بڑھ کر اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے کہ خوشحال طبقہ اس عبادت کے ذریعے بھوک اور پیاس کا مزا چکھے اور پھر وہ اس طبقے کی ضروریات پوری کرنے کی فکر کرے جو اگر اسی حال میں رہے اور اس کے غصے کی آگ بھڑک اٹھے تو وہ ہر چیز

کو جلا کر خاکستر اور زندگی کو نیست و نابود کر دے!

رمضان المبارک کے روزے مساوات اور اتحاد کا مظہر ہیں کیونکہ اس مہینے میں خوشحال اور بدحال سب ہی لوگ نفسانی خواہشات سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور ایک جیسی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔

حج کا فلسفہ

ایک اور عظیم اسلامی عبادت حج ہے۔ یہ ایک اجتماعی عبادت ہے جو سال کے معینہ ایام میں مکہ کی عالیشان تاریخی سرزمین پر انجام پاتی ہے۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کرنے کے علاوہ مختلف طریقوں سے اسلامی معاشرے میں بڑے مفید اثرات پیدا کرتی ہے کیونکہ:

● ـــــ ایک ایسی عبادت جس کی ابتدا کامل تجرد اور پوری پوری آزادی کے ساتھ فقط سادہ کپڑے پہننے سے ہوتی ہو، خدا کی بارگاہ میں اس کے بندوں کی برابری کی علامت ہے اور خود انسان کی ایک بہت بڑی آرزو یہ ہے کہ ایک دنیا کے انسان نسل، زبان، رنگ اور دولت جیسے برتری کے بے اصل معیارات کو بالائے طاق رکھ کر سب کے سب اپنے آپ کو پروردگار کے سامنے مساوی اور برابر سمجھیں۔ حج ایک ایسی عبادت ہے جو اس مقصد کو صحیح ثابت کرتی ہے اور اس امر کا موجب بنتی ہے کہ ایماندار لوگ معاشرتی امتیازات کو اپنی برتری کا ذریعہ نہ سمجھیں۔

● ـــــ یہ ایک ایسا عظیم اجتماع ہے جس کے ارکان دنیا کی مسلمان مملکتوں کے حقیقی نمائندوں سے تشکیل پاتے ہیں۔ حج مسلمانانِ عالم کی ایک عظیم سالانہ کانگریس شمار ہوتی ہے جو ہر سال منعقد کی جاتی ہے۔

دین اسلام چند اخلاقی قوانین اور تربیتی روایات کا مجموعہ نہیں جس کا مقصد لوگوں کی روح کی اصلاح کے علاوہ کچھ نہ ہو اور اس بنا پر وہ ایسے سالانہ ہفتہ وار اور روزانہ اجتماعات منعقد کرنے سے باز رہے جو سیاسی پارٹیوں اور متحرک اور زندہ جماعتوں

سے مخصوص ہیں۔ اس کے برعکس یہ ایک آفاقی اور جامع آئین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر نظر رکھتا ہے خواہ وہ اخلاقی ہوں یا معاشرتی اور سیاسی ہوں یا اقتصادی اور عسکری۔

اسی بنا پر پیغمبر اسلام ؐ نے سیاسی قوانین وضع کر کے اور سرزمین مکہ میں سالانہ کانگریس کی تشکیل کی دعوت دے کر اپنے دین کی بقا، ابدیت اور آزادی کو محفوظ کر دیا ہے اور قدرتی طور پر اس کانگریس کے اثرات دنیا کی سیاسی اور متحرک پارٹیوں کے سالانہ اجلاس کے اثرات سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

بالآخر سیاسی لیڈروں نے موجودہ دور میں ایسے موضوعات کی اہمیت کی جانب توجہ دینی شروع کی ہے جبکہ اسلام نے چودہ سو سال پیشتر ان کی بنیاد رکھ دی تھی اور ان سے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیے تھے۔ مسلمان مفکرین جو قدرتی طور پر اس اجتماع میں شرکت کریں گے یہ کر سکتے ہیں کہ دنیائے اسلام کے حالات میں آخری تبدیلیوں کا جائزہ لیں اور دقیق معلومات فراہم کر کے اور تبادلۂ خیال کر کے مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے، سرزمین اسلام کو آزادی اور استقلال کے منافی عوامل سے پاک کرنے اور دنیا کے مسلمانوں کی ہمہ پہلو ترقی کے لیے جدوجہد کریں۔

جو اجتماع دنیا کے مسلمانوں کے مل بیٹھنے کے لیے سب سے بڑا حلقہ ہو اور مسلم نمائندوں کو ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ کرے اس سے بڑھ کر کونسا اجتماع فائدہ مند ہو سکتا ہے؟

یہ کانگریس مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشرتی حالت بہتر بنانے میں شایانِ شان مدد کر سکتی ہے کیونکہ دانشمند اور صاحب نظر لوگ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد پرسکون، پُر اخلاص اور روحانی ماحول میں تبادلۂ خیال کر کے مسلمانوں کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔

حج کے سالانہ اجتماع نے ظلم و ستم اور جبر کی زنجیریں توڑنے کے لیے ہمیشہ بہت سی آزادی کی تحریکوں کے لیے جوش اور جذبہ پیدا کیا ہے اور تاریخ اسلامی اور فرزندان اسلام

کے برپا کیے ہوئے انقلابات کی جانب رجوع کرنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ سامراجی اور استعماری حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لیے اسلامی تحریکوں کا بیج ایام حج میں ہی بویا گیا ہے اور یہ سرزمین ایسی آزادیوں کا منبع رہی ہے۔

یہ تھا اسرارِ حج کا ایک نمونہ۔ بعض دانشمندوں کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ دنیا حج کی اہمیت اور اسرار کو سمجھ لے!

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تمام اسلامی عبادات ایسے اسرار کی حامل ہیں جو خود عبادت کرنے والے پر براہِ راست یا اس معاشرے پر کھلتے ہیں جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔

اعلم کی تقلید کیوں کرنی چاہیے ؟

سوال: عملیہ رسالوں میں لکھا گیا ہے کہ اعلم کی تقلید واجب ہے۔ اس حکم کا ماخذ کیا ہے ؟

جواب: اعلم کی تقلید کا موضوع ان موضوعات میں سے ہے جو فقہاء کے درمیان مشہور و معروف ہیں اور انہوں نے اس کے لیے مختلف دلائل دیے ہیں جن کا ایک واضح نمونہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

جاہل کے عالم سے رجوع کرنے اور اس کی تقلید کرنے کی بنیاد دنیا کی معقول روش پر ہے اور وہ ان معنوں میں کہ تمام اقوامِ عالم میں یہ دستور ہے کہ جو لوگ کسی فن میں مہارت نہیں رکھتے اگر انہیں اس فن سے متعلقہ کسی مسئلے سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ ان لوگوں سے رجوع کرتے ہیں جو اس فن میں مہارت رکھتے ہیں مثلاً جو لوگ طبی مسائل سے واقف نہیں ہوتے وہ بیمار پڑنے پر ڈاکٹر سے اور جو لوگ فنِ تعمیر سے نابلد ہوتے ہیں وہ بوقتِ ضرورت انجینئر اور معمار سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ امر بھی بدیہی ہے کہ جب کبھی اہلِ فن کی آراء ایک دوسرے سے مختلف ہوں مثلاً ایک ڈاکٹر کسی بیماری کا علاج ایک مخصوص طریقے

ے صحیح سمجھتا ہو اور دوسرا ڈاکٹر کسی دوسرے طریقۂ علاج پر یقین رکھتا ہو تو اس صورت میں بیمار شخص لازمی طور پر اس ڈاکٹر کے نظریے کی پیروی کرے گا جس کی طبّی معلومات وسیع تر، سابقہ تجربہ بیشتر اور اپنی فنی مہارت اعلیٰ تر ہو۔ مختصر یہ کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں اعلم ہو۔ ایک فن کے جاننے والوں کی آراء میں اختلاف کی صورت میں یہ ایک معقول روش ہے جس کی پیروی مختلف اقوام کے لوگ کرتے ہیں۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے یہ اعلم کی تقلید کے لازم ہونے کی ایک دلیل ہے۔ فقہاء نے اس سلسلے میں کئی ایک اور دلائل کا ذکر بھی کیا ہے جن کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں۔

نماز عربی زبان میں کیوں پڑھنی چاہیے؟

سوال: نماز عربی زبان میں کیوں پڑھی جائے جبکہ خدا کو اپنی زبان میں پکارنا چاہیے؟ کیا یہ صورتِ حال دینِ اسلام کے آفاقی ہونے کے منافی نہیں؟

جواب: اتفاق سے نماز کا عربی زبان میں پڑھنا دینِ اسلام کے آفاقی ہونے کی علامات میں سے ایک علامت ہے کیونکہ جو جماعت ایک صف میں کھڑی ہو اور ایک واحد محاذ پر سرگرمِ عمل ہو اس کے افراد کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زبان بھی ایک ہو جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے کی باتیں سمجھ سکیں یعنی مادری اور مقامی زبان کے علاوہ ان کی ایک عمومی اور عالمگیر زبان بھی ہونی چاہیے اور اس کے بغیر ایک جماعت کی وحدت یقینی طور پر مکمل نہیں ہو سکتی۔

دورِ حاضر میں کئی ایک دانشوروں کا خیال ہے کہ جب تک ساری دنیا ایک مملکت کی شکل اختیار نہ کرے اہلِ عالم خوش بختی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے منصوبے تیار کیے ہیں اور ان کے پروگرام کی ایک شق ایک

بین الاقوامی اور آفاقی زبان کو وجود میں لانا ہے۔

مختصر یہ کہ تمام مسلمانوں کا ایک زبان میں نماز پڑھنا ان کی وحدت کی علامت اور یگانگت کی نشانی ہے اور اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اہلِ فن کے اعتراف کے مطابق عربی دنیا کی وسیع ترین اور جامع ترین زبانوں میں سے ہے۔ یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقے اسے بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر سکتے ہیں اور حسن تفاہم اور اسلامی یگانگت کے حصول کی خاطر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں نماز کا ایک معین صورت میں ادا کرنا اسے قطع و برید، تحریف، خرافات کی آمیزش اور بے بنیاد مطالب سے محفوظ رکھتا ہے (یعنی ایسے مطالب جو اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرتے وقت ناواقف افراد کی مداخلت کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں) اور اس ذریعے سے اس اسلامی عبادت کی روح بالکل محفوظ رہتی ہے لہٰذا ہر مسلمان کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ جہاں تک ہو سکے دینی زبان سے واقف ہو اور اسے یہ علم ہو کہ اپنے خدا سے کیا کہہ رہا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ نماز کے ترجمے کا یاد کرنا (جس کا خلاصہ کتاب کے ایک صفحے میں دیا جا سکتا ہے) اتنا سادہ اور آسان ہے کہ ممکن ہے اسے ایک گھنٹے میں (تمام عمر کے لیے) یاد کر لیا جائے۔

المختصر جیسا کہ ہم جانتے ہیں مسئلہ توحید اسلام کے تمام اصول اور فروع میں ایک بنیادی چیز شمار ہوتا ہے اور قبلۂ واحد کی جانب منہ کر کے مقررہ اوقات میں ایک مخصوص زبان میں نماز ادا کرنا اس وحدت کا ایک نمونہ ہے۔

اگر مراسم حج کی ادائیگی کے وقت ہم مکہ میں ہوں اور نمازِ جماعت کا مشاہدہ کریں جس میں دنیا بھر کی مختلف نسلوں اور قوموں کے لاکھوں افراد شرکت کرتے ہیں اور سب مل کر اللہ اکبر .... کہتے ہیں تو اس وقت ہم اس حکم کی عظمت اور گہرائی کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ اگر ہر شخص یہ روح پرور جملہ اور نماز کے دوسرے اذکار اپنی مقامی زبان میں ادا کرے تو نماز میں بڑی ناپسندیدہ افراتفری پیدا ہو جائے۔

نماز پڑھتے وقت رو بقبلہ کیوں کھڑا ہونا چاہیے؟

سوال: نماز پڑھتے وقت رو بقبلہ کھڑا ہونا کیوں ضروری ہے جب کہ خدا ہر جگہ ہے اور کوئی مخصوص سمت نہیں رکھتا؟

جواب: قبلہ کی جانب منہ کر کے نماز پڑھنے کی یہ وجہ نہیں کہ خدا کوئی مخصوص مقام یا سمت رکھتا ہے۔ قرآن مجید قبلہ سے متعلقہ آیات میں اور بالخصوص دو مقامات پر اس حقیقت کی تشریح کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"

(سورۂ بقرہ آیت ۱۱۵)

یعنی مشرق اور مغرب خدا کے ہیں اور تم جدھر بھی منہ کرو وہاں خدا موجود ہے۔

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے:

"قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ" (سورۂ بقرہ آیت ۱۴۲)

یعنی مشرق اور مغرب خدا کے ہیں۔ (اور اس کی ذات کے لیے ہر جگہ

یکساں ہے)۔

درحقیقت قبلہ رو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان چونکہ جسم رکھتا ہے اس لیے دورانِ نماز اسے مجبوراً کسی ایک طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے اور اسلام چاہتا ہے کہ اس عبادت (نماز) کی تکمیل کے لیے اس صورتِ حال سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرے۔ خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں خانہ کعبہ توحیدِ الٰہی کا قدیم ترین مرکز ہے۔ یہ وہ گھر ہے جو فرمانِ توحید حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں تعمیر ہوا اور تمام پیغمبرانِ خدا اور راہنمایانِ توحید کی توجہ کا مرکز رہا ہے لہٰذا اس مرکزِ توحید کی جانب توجہ کے معنی خدا کی جانب توجہ کے ہیں۔ یہ درست ہے کہ خدا لامکان ہے لیکن جو شخص ایک ایسے مرکز کے سامنے کھڑا ہو وہ کسی ایک وجوہ کی بنا پر خدا سے نزدیک تر ہوتا ہے اور گویا اپنے آپ کو اس کی بارگاہ میں حاضر پاتا ہے۔

علاوہ ازیں دنیا کے مسلمانوں کا دن رات میں پانچ مرتبہ اس مقدس مرکز کی جانب متوجہ ہونا ان کے دل وجان میں وحدت اور یگانگت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسلامی وحدت اور دنیا کے مسلمانوں کے مابین ہم آہنگی کے قیام میں مدد دیتا ہے اور دنیا کے مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے مختلف اسلامی معاشروں کو باہم مربوط کرتا ہے اور ان کی شوکت اور عظمت ظاہر کرتا ہے اور بالآخر اسلام کی آفاقی تعلیمات کی ماہیت کو مقصد اور عقیدے کی وحدت کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ہم پنجگانہ نمازیں تین وقت میں کیوں پڑھتے ہیں؟

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم "ظہر اور عصر" یا "مغرب اور عشاء" کی نمازیں ملا کر اور ایک وقت میں ادا کرتے ہیں جب کہ ان نمازوں میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص وقت ہے اور اسلام کے بزرگ پیشوا ان میں سے ہر نماز اس کے اپنے وقت پر یعنی پنجگانہ نمازوں کو پانچ وقت پڑھا کرتے تھے؟

جواب: اس امر میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ نماز کا پانچ وقت قائم کرنا اور ہر نماز اس کے فضیلت کے وقت میں ادا کرنا رسولِ اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ اور صدر اسلام کے عام مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے اور وہ عموماً پانچ نمازیں پانچ وقت میں پڑھا کرتے تھے۔

اس معاملے میں کوئی کلام نہیں لیکن کلام اس میں ہے کہ آیا "تفریق" اور دو نمازوں کے درمیان فاصلہ رکھنا واجب ہے (جیسا کہ اہلِ سنت کے بہت سے فقہاء قائل ہیں) یا یہ ایک مستحب کام ہے اور کیا دوسرے مستحبات کی طرح جنہیں انجام دینے

یا ترک کرنے میں انسان مختار ہے ۔ وہ نمازیں بھی ملا کر یا علیحدہ علیحدہ پڑھنے پر مجبور نہیں خواہ ان کا علیحدہ علیحدہ پڑھنا بہتر ہی کیوں نہ ہو؟

شیعہ علماء نے ان احادیث کی پیروی کرتے ہوئے جن سے رسول اکرمؐ کے عمل کا پتا چلتا ہے اور ان روایات کو مدّنظر رکھتے ہوئے جو ائمہ اہلبیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں اور آیاتِ قرآنی کے ظواہر پر عمل پیرا ہوتے ہوئے تمام اسلامی ادوار میں نمازوں کے درمیان تفریق کو مستحب سمجھا ہے اور لوگوں کو بتایا ہے کہ نمازوں کے درمیان فاصلہ رکھنا اور ہر نماز اس کے فضیلت کے وقت میں ادا کرنا مستحب اور افضل ہے لیکن اس کے باوجود اس مستحب کو ترک کیا جا سکتا ہے اور مستحب کے معنی بھی یہی ہیں۔

بلاشبہ دو نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان میں سے ایک نماز کو دوسری کے وقت میں پڑھتے ہیں مثلاً اگر ہم مغرب اور عشاء کی نماز رات کے پہلے حصّے میں پڑھیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم عشاء اس کے صحیح وقت کے علاوہ کسی وقت میں بجا لائے ہیں بلکہ ہم نے دونوں نمازیں ان کے مشترک وقت میں پڑھی ہیں کیونکہ مغرب کے آغاز سے آدھی رات تک دونوں نمازوں کا وقت شروع ہو جاتا ہے (بجز اس کے کہ مغرب کی ابتداء سے اندازاً تین رکعتیں پڑھنے کا وقت نماز مغرب کے لیے اور آخر سے اندازاً چار رکعت پڑھنے کا وقت نماز عشاء کے لیے مخصوص ہے اور باقیماندہ وقت دونوں نمازوں کے مابین مشترک ہے) اور ہم جب بھی عشاء کو مغرب کے ساتھ ملا کر یعنی اوّل شب میں یا مغرب کو آخر وقت میں نماز عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھیں۔ دونوں نمازیں ان کے اپنے وقت میں ادا کرتے ہیں لیکن مستحب یہ ہے کہ نمازی مغرب کو رات پڑتے ہی اور نمازِ عشاء کو زوالِ شفق کے بعد بجا لائے اور اگر کوئی شخص اس شرط کی رعایت نہ کرے تو وہ فقط ایک مستحب کو ترک کرتا ہے۔

دو نمازیں ملا کر پڑھنا کیوں جائز ہے؟

دو نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے جواز کے لیے ہماری دلیل اور گواہ وہ حدیثیں

ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہیں اور جنہیں مرحوم شیخ حر عاملی نے اپنی کتاب[1] میں جمع کیا ہے۔

تاہم یہ بات بھی مدّنظر رکھنی چاہیے کہ فقط شیعہ محدّثین نے ہی یہ احادیث نقل نہیں کیں بلکہ اہلِ سنّت کے محدّثین نے بھی نمازوں کو ملاکر پڑھنے کے جواز کے بارے میں (حتیٰ کہ ایسے مواقع پر جب کوئی عذر بھی درپیش نہ ہو) رسول اکرمؐ سے روایات نقل کی ہیں اور اپنی معتبر کتابوں میں ابنِ عباس، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر سے مروی تقریباً دس ایسی روایات کا ذکر کیا ہے جنکی تمام جزئیات نقل کرنے کی گنجائش اس کتاب میں نہیں اور ہم ان میں سے فقط چند ایک کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱ــــ دنیائے اہلِ سنت کے معروف محدّث احمد بن حنبل اپنی مشہور کتاب میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں:

"صلی رسول اللّٰه (ص) الظهر والعصر جميعًا، والمغرب والعشاء جميعًا من غير خوف ولا سفر"[2]

یعنی رسولِ اکرمؐ ظہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء دشمن کے خوف یا سفر جیسے عذر کے بغیر باہم ملاکر بجالائے۔

۲ــــ پھر یہی محدّث جابر بن زید کے ذریعے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ:

"میں رسولِ اکرم کے ساتھ نمازِ ظہر و عصر کی آٹھ رکعتیں اور نمازِ مغرب و عشاء کی سات رکعتیں ملاکر بجالایا ہوں اور یہ حدیث ابن عباس سے مختلف عبارتوں میں نقل کی گئی ہے۔"

۳ــــ اس کے علاوہ وہ اپنی کتاب میں عبداللہ شقیق سے نقل کرتے ہیں کہ:

"ایک دن ابنِ عباس لوگوں کے سامنے خطبہ دے رہے تھے اور ان کی

---

[1] وسائل الشیعہ۔ کتاب صلٰوۃ کے نمازوں کے وقت سے متعلق ابواب (باب ۳۲ اور ۳۳)

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۲۲۱

تقریر نے اتنا طول کھینچا کہ ستارے آسمان پر نمودار ہو گئے۔ بنی تمیم کے ایک شخص نے اٹھ کر اعتراض کے طور پر کہا:

الصلوٰۃ، الصلوٰۃ

یعنی اب نمازِ مغرب کا وقت ہے اور اگر تقریر جاری رہی تو اس کا وقت ختم ہو جائے گا۔

ابن عباس نے اس شخص سے کہا:

"میں رسولِ اکرمؐ کی سنت اور روش سے تم سے زیادہ واقف ہوں میں نے دیکھ رکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے ظہر اور عصر کی نماز اور اسی طرح مغرب اور عشا کی نمازیں ملا کر پڑھی ہیں۔"

راوی کہتا ہے کہ مجھے اس بارے میں شک ہوا اور میں نے اس معاملے کا ذکر ابوہریرہ سے کیا۔ اس نے ابن عباس کے قول کی تصدیق کی۔[۱]

۴۔ مشہور محدّث مسلم بن الحجاج القشیری (متوفی ۲۶۱ ہجری قمری) نے اپنی صحیح میں "جمع نماز در حضر" (حضر میں نمازوں کا ملا کر پڑھنا) کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں اس موضوع پر چار روائتیں نقل کی ہیں جن میں سے تین ابن عباس پر اور ایک معاذ بن جبل پر ختم ہوتی ہے۔[۲] ان چار حدیثوں کا مضمون بھی جو کچھ اوپر نقل کیا گیا ہے اس کے مطابق ہے اور ان روایات میں ایک نئے نکتے کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب راوی ان نمازوں کو ملا کر پڑھنے کی وجہ پوچھتا ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ:

"اراد ان لا یحرج امتہ"

---

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۲۵۱۔ کتاب موطأ مالک کے شارح زرقانی نے اپنی شرح میں اس سے ملتا جلتا مضمون جلد ا صفحہ ۲۶۳ پر درج کیا ہے۔

[۲] صحیح مسلم۔ جلد ۲ صفحہ ۱۵۱۔

یعنی آپ اپنی امت کو زحمت اور مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

یہ وجہ شیعہ روایات میں بھی وارد ہوئی ہے اور اس باب میں جو روایات امام صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہیں ان میں بھی یہ نکتہ موجود ہے۔ [1]

اس مسئلے (یعنی دو نمازیں ملا کر پڑھنے) کے راوی ابن عباس اور معاذ تک محدود نہیں ہیں۔ طبرانی عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے ظہر اور عصر کو اور نمازِ مغرب و عشاء کو اس لیے اکٹھا کر دیا تاکہ آپ کی امت کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ [2]

اور بالکل یہی مطلب عبداللہ بن زبیر سے بھی نقل ہوا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس حالت میں جب آپ سفر میں نہ تھے دو نمازوں کو اکٹھا ادا کیا تاکہ آپ کی امت کو مشقت نہ اٹھانی پڑے۔ [3]

یہ ان احادیث میں سے چند ایک ہیں جنہیں اہل سنت کے محدثین نے اپنی حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا ہے اور سبھی اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ نمازوں کو الگ الگ پڑھنا مستحب ہے اور اگر ہم کسی وقت یہ محسوس کریں کہ اس مستحب کی رعایت کرنے سے خود فریضے کی ادائیگی پر زد پڑتی ہے تو خود رسول اکرمؐ کی ہدایات کے مطابق ہم اسے ترک کر سکتے ہیں یعنی دونوں نمازیں ملا کر پڑھ سکتے ہیں۔

دورِ حاضر میں بہت سے خطوں میں طرزِ زندگی کچھ یوں ترتیب پا گئی ہے کہ اس امرِ مستحب کی رعایت کرنا تکلیف کا موجب بن گیا ہے اور اکثر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ خود نماز کی ادائیگی سے پہلو تہی کرنے لگتے ہیں۔ اس موقع پر رسول اکرمؐ کی رہنمائی سے فیضان حاصل کرتے ہوئے زیادہ اہم امر کی بجا آوری کی خاطر تفریق

---

[1] وسائل الشیعہ۔ کتاب صلوٰۃ۔ ابواب وقت باب ۳۲۔ احادیث ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۷

[2] شرح موطا زرقانی۔ صفحہ ۲۶۳۔

[3] کنز العمال صفحہ ۲۴۲

(نمازیں الگ الگ پڑھنے) کے مسئلے کو ترک کیا جا سکتا ہے۔ اہل سنت کے بہت سے فقہاء کا نظریہ اب بھی یہی ہے لیکن بعض امور کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ اپنی رائے کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں۔ [1]

---

[1] رسالۃ الاسلام۔ سال ۷، شمارہ ۲ صفحہ ۱۵۶

نماز انسان کو گناہ سے کیونکر باز رکھتی ہے ؟

سوال: قرآن مجید کے نقطہ نظر سے نماز کے اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان کو برے اور ناجائز کاموں کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے کیونکہ ارشاد ہوا ہے کہ:

"نماز قائم کرو کیونکہ نماز انسان کو برے اور ناجائز کام کرنے سے روکتی ہے" (سورۂ عنکبوت آیت ۴۵)

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے نمازی گناہوں اور برے کاموں میں مبتلا ہوتے ہیں اور نماز ان کے اقوال اور افعال پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ اس صورت میں مذکورہ بالا آیت کے کیا معنی ہیں؟

جواب: اصولاً اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ انسان کو جرم اور گناہ سے باز رکھنے کے لیے ایمان اور خدا کی یاد ہی بنیادی عامل ہے۔ جو انسان خدا سے غافل ہو وہ اپنے اعمال اور کردار کے بارے میں نہیں سوچتا اور اپنی خواہشات اور میلانات کو پورا کرنے کے لیے کوئی حد نہیں

پہچانتا۔ اس کے برعکس خدا کی یاد ہمیں خودسری، ہوس رانی اور حدود نہ پہچاننے سے باز رکھتی ہے۔ اسی خدا کی یاد جو ہمارے تمام چھوٹے بڑے کاموں سے آگاہ ہے اور جو کچھ ہمارے خیال سے گزرتا ہے اس سے واقف اور باخبر ہے۔

ناجائز خواہشوں اور تمناؤں پر قابو پانے کا فطری، مؤثر اور سیدھا طریقہ خدا کی، خدارسیدہ لوگوں کے مقام کی، گناہگاروں کی سزا کی اور خدا کے فرمانبرداروں کی جزائے نیک کی یاد ہے۔

قرآن مجید مردانِ حق کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے:

"رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ"

(سورۂ نور آیت ۳۷)

"وہ لوگ جنہیں تجارت اور لین دین خدا کی یاد سے باز نہیں رکھتا"

اس میں کوئی کلام نہیں کہ خدا سے غافل اور بے خبر رہنا عقل کی تاریکی اور ضمیر کے نور کے مدھم ہو جانے کا موجب ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے خدا کی یاد کو خاص اہمیت دی ہے اور اس سلسلے میں یوں فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى جَعَلَ الذِّكْرَ جِلَاءً لِّلْقُلُوبِ، تَسْمَعُ بِهٖ بَعْدَ الْوَقْرَةِ، وَتُبْصِرُ بِهٖ بَعْدَ الْعَشْوَةِ، وَتَنْقَادُ بِهٖ بَعْدَ الْمُعَانَدَةِ۔[1]

"خدا تعالٰے نے اپنی یاد کو بندوں کے دلوں کے لیے صیقل اور روشنی قرار دیا ہے جس کی تابانی سے ان کے کان سننے لگتے ہیں اور آنکھیں دیکھنے لگتی ہیں اور وہ دشمنی اور فساد کو چھوڑ کر فرمانبردار ہو جاتے ہیں۔"

---

[1] نہج البلاغہ از صبحی صالح خطبہ ۲۲۲، نسخہ ترجمہ مفتی جعفر حسین مرحوم خطبہ ۲۱۹

امام علی علیہ السلام نے ان جملوں میں "غفلت" کو دلوں کے لیے ایک قسم کا بہرہ پن اور اندھا پن قرار دیا ہے جو انسان کی حق وحقیقت سے سرکشی، لڑائی جھگڑے اور دشمنی کا باعث بنتی ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ خدا کی یاد کو دل کی شنوائی اور روشنی کا سرمایہ گردانتے ہیں جو سرکش خواہشات کو قابو میں لاتی ہے اور انسان کو حقیقت کے خلاف نبرد آزما ہونے سے باز رکھتی ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اسکی بنا پر جو شخص خدا سے اور اس کی جزا اور سزا سے غافل ہو وہ ایک ایسے اندھے اور بہرے انسان کی مانند ہے جو ایک سرکش گھوڑے پر سوار ہو۔ بلاشبہ وہ گھوڑا اسے پتھروں پر پٹخے گا اور ایک گھاٹی کے درمیان لڑھکا دے گا لیکن جو افراد بیدار اور یاد رکھنے والے دلوں کے مالک ہوں وہ اپنے اعمال کے ردِ عمل کا نزدیک سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ سچی بات پوری توجہ سے سنتے ہیں اور سرکش نفس کو خدا کی یاد کے ذریعے قابو میں رکھتے ہیں۔

امام باقر علیہ السلام ان امور کے سلسلے میں جن کی وہ ایک دوست کو نصیحت کرتے ہیں یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"خدا کو ہمیشہ یاد کرتے رہو کیونکہ خدا کی یاد انسان اور ناجائز کام کے ارتکاب کے درمیان ایک رکاوٹ بن کر حائل ہو جاتی ہے۔" [۱]

اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

"دو مواقع پر خدا کو یاد کرو۔ ایک تو مصیبت کے وقت اور دوسرا اس وقت جب تو کسی گناہِ صغیرہ سے دوچار ہو اور گناہ سے دوچار ہونے کے موقع پر خدا کو یاد کرنا زیادہ اہم ہے کیونکہ اس کی یاد انسان اور گناہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔"

---

[۱] بحار الانوار جلد ۱ صفحہ ۳۸۶

ظاہر ہے کہ یادِ خدا کے بھی درجے ہیں اور وہ ہر صورت میں یکساں ہرگز نہیں ہوتی۔ بعض اوقات وہ ایسے مرحلے پر پہنچ جاتی ہے کہ ہر قسم کے گناہ کے مقابلے میں انسان کا بیمہ کردیتی ہے اور اس سے گناہ کا ارتکاب فطری طور پر محال ہو جاتا ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جو خدا کی یاد کی ضوریزی میں پرسکون قلوب، بیدار دل، روشن آنکھیں، سننے والے کان اور فرمانبردار نفوس رکھتے ہیں۔

بہت سے لوگوں میں خدا کی یاد متوسط درجے کی ہوتی ہے۔ مثلاً کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ کچھ گناہوں میں آلودہ ہو جاتے ہیں لیکن کسی صورت میں بھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ دوسروں کا خون بہائیں، کسی یتیم کا مال کھائیں یا کسی کی آبرو پر ہاتھ ڈالیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان گناہوں کے لیے خدا کی مقرر کردہ سزائیں بے حد سخت اور کڑی ہیں اور ان کا ضمیر ان گناہوں کا مقابلہ کرتا ہے۔

بعض اوقات خدا کی یاد اتنی کمزور اور دھندلی ہوتی ہے کہ وہ فقط ترکِ معاصی کی بنیاد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اکثر زیادہ طاقتور عوامل اس بنیاد کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں لیکن جب خدا کی یاد پر اس کے ضعیف اور نام نہاد علت ناقص ہوتے ہوئے ریاضت کی جائے تو وہ انسان کو بہت سے گناہوں سے باز رکھ سکتی ہے۔

نماز خدا کی یاد کا وسیلہ ہے

نماز کے اسرار میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا کی یاد کی راہ پر ڈال دیتی ہے اور خود قرآن مجید بھی اس چیز کو نماز کے مقاصد میں سے ایک مقصد قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"نماز کو میری یاد کے لیے قائم کرو" (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۱۴)

ظاہر ہے چونکہ نماز عبادت ہے اور اسے قربت کے مقصد سے اور خدا کی خاطر انجام دینا ضروری ہے لہٰذا یہ قدرتی طور پر خدا کی یاد کا موجب ہوگی۔

علاوہ ازیں نماز پڑھنے والا اپنی زبان پر ایسے اذکار اور جملے جاری کرتا ہے

جو تمام کے تمام خدا کی جانب توجہ کا باعث اور اس کی یاد کا سرچشمہ ہیں مثلاً سورۂ حمد جسے ہم نماز کی حالت میں پڑھتے ہیں خدا کی تعریف اور اس کی صفات اور افعال اور اس کے بعد اس کی بارگاہِ اقدس میں بندوں کی مختلف گزارشات پر مشتمل ہے اور یہی صورت نماز کے دوسرے اذکار کی ہے۔

نماز ہماری روح میں جو اثر چھوڑتی ہے وہ ایمان کی روح کی تقویت اور خدا کی جانب توجہ ہی ہے ــــ اور یہ توجہ ــــ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، کئی ایک درجے رکھتی ہے۔ جو لوگ بہت سے گناہوں کے ارتکاب کی پروا نہیں کرتے ان کے بارے میں ترک معاصی کی نسبت سے خدا کی یاد علت تامہ نہیں بلکہ اس کی صورت فقط ایک بنیاد کی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ فرمانے سے کہ "نماز انسان کو گناہوں سے باز رکھتی ہے" قرآن مجید کا یہ مقصد نہیں کہ نماز پڑھنے والا تمام گناہوں کے مقابلے میں معصوم ہو جاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ نماز خدا کی یاد کا موجب اور مقام ربوبیت کی طرف توجہ کا سبب بنتی ہے اور اس قسم کی توجہ کا فطری اثر یہ ہے کہ یہ انسان میں اطاعت کی روح اور ترک معاصی کی بنیاد پیدا کر دیتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی کافی امکان ہے کہ خدا کی جانب توجہ کے کمزور ہونے کی بنا پر زیادہ طاقتور عوامل اس کا اثر زائل کر دیں۔[1]

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر نماز، نماز ہو تو ہر شخص میں گناہ کا مقابلہ کرنے کی تاثیر چھوڑتی ہے۔ کبھی یہ تاثیر بہت طاقتور اور کبھی کمزور ہوتی ہے اور گناہوں کے فرق اور نمازوں کے فرق کی بنا پر اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ نماز جتنی زیادہ باروح اور کامل ہو اتنا ہی اس کا تربیت دینے اور گناہوں سے باز رکھنے کا اثر زیادہ قوی ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں نماز، نمازی افراد کو بہت سے گناہوں سے عملاً باز رکھتی ہے اور

---

[1] تفسیر المیزان ــــ علامہ محمد حسین طباطبائی ــــ جلد ۱۶ صفحہ ۱۴۱

اس کے ساتھ ساتھ دوسرے گناہوں کو ترک کرنے کے لیے بھی میدان ہموار کرتی ہے کیونکہ نمازی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی نماز کی صحت اور قبولیت کے لیے بہت سے گناہوں سے اجتناب برتے مثلاً نماز کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ جو وسائل نماز کی ادائیگی اور اس کی تیاری کے سلسلے میں استعمال کیے جائیں وہ سب شرعاً جائز اور مباح ہوں۔ یہ چیز بتدریج اس امر کا موجب بنتی ہے کہ نماز پڑھنے والا بہت سے گناہ ترک کر دے اور اپنے کام کاج اور کسبِ معاش کے سلسلے میں ہر قسم کے حرام سے اجتناب برتے کیونکہ یہ بہت مشکل ہے کہ ایک شخص فقط نماز سے تعلق رکھنے والے امور کے بارے میں ان کے حلال ہونے کی پابندی کرے اور دوسرے معاملات میں اس چیز کی پروا نہ کرے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسکی گواہی اس بات سے ملتی ہے کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ اس فریضے کے ترک کرنے کے نتیجے میں بہت سے دوسرے فرائض مثلاً روزہ، حج، زکات اور خمس کی ادائیگی بھی ترک کر دیتے ہیں وہ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس جو لوگ نماز کو کم از کم اس کی ظاہری صورت میں ادا کرتے ہیں وہ قدرتی طور پر کچھ گناہ اس کی خاطر ترک کر دیتے ہیں اور جو لوگ اس فریضے کو زیادہ کامل شکل میں انجام دیتے ہیں وہ تو بیشتر یا تمام گناہ ترک کر دیتے ہیں۔[1]

المختصر نماز، نماز پڑھنے والے تمام لوگوں پر ایک قسم کا تربیتی اثر چھوڑتی ہے خواہ یہ اثر طاقتور اور جامع ہو یا کمزور اور دھندلا اور اس کا انحصار نماز کی ادائیگی اور اس کے آداب اور روح کی کیفیت پر ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان۔ جلد ۱۶۔ صفحہ ۱۴۱

نماز آیات کا کیا مقصد ہے؟

سوال: سورج گرہن یا چاند گرہن کے موقع پر نماز آیات کیوں بجا لانی چاہیے اور اسی طرح جب زلزلہ آئے یا ہولناک آندھی چلے یا بجلی کڑکے یا آسمان سے ہیبت ناک آوازیں سنائی دیں تو نمازِ آیات کا ادا کرنا کیوں ضروری ہے؟

جواب: سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت نمازِ آیات پڑھنے کا حکم دو خاص نکتوں کا حامل ہے۔

(۱) بالعموم سورج، چاند اور نظامِ شمسی انسانوں کی نظر میں ایک تعجب انگیز نظام کے دارا ہیں۔ سورج اپنی سنہری کرنوں کے ذریعے تمام جانداروں اور نباتات کو نشو ونما بخشتا ہے۔ چاند اپنی منظم اور دقیق گردش کے ذریعے وقت کے سفر کو ماپتا ہے اور اپنی روپہلی کرنوں کے ساتھ رات کی تاریکی کو گھٹا کر زمین کو ہمارے لیے منور کر دیتا ہے۔

ان عظیم اور حیرت انگیز آثار نے ازمنۂ گزشتہ میں ظاہر بین لوگوں کو متاثر

کیا اور ان کے ذہنوں میں یہ تصور پیدا کیا کہ چونکہ ظاہراً طور پر یہ (سورج اور چاند) جانداروں، نباتات اور جمادات پر پوری شان و شوکت کے ساتھ اختیار رکھتے ہیں اس لیے یہ انسانوں کی تقدیر پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے معبود اور خالق ہیں۔ یوں سورج اور چاند کی پرستش ہونے لگی اور بہت سے لوگ ان اجرام نورانی کی خدائی کے معتقد ہو گئے اور سورج اور چاند کو خدا کا مقام دے دیا جو تمام عالمِ ہستی کا حاکمِ مطلق ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گروہ کے عقیدے پر جو سب سے زیادہ کاری ضرب لگائی وہ یہ تھی کہ آپ نے ان کرّوں کے دنیا کے تمام نظام اور قوانین کے تابع ہونے کا اعلان کیا[1] اور ان درخشندہ اجرام کے غروب اور نظروں سے غائب ہونے کو ان کی محکومیت کا گواہ ٹھیرایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اجرام فلکی کا غروب ہونا ان کی محدودیت کی سب سے بڑی نشانی ہے اور اگر کوئی محکوم اور محدود چیز خود دوسرے کے قبضے میں ہو اور بجائے خود عرصۂ کائنات پر روشنی پھیلانے کا اختیار تک نہ رکھتی ہو تو یہ بات اس کے خدا نہ ہونے پر گواہی دیتی ہے اور اس کے مخلوق ہونے کی دلیل ہے۔

سورج اور چاند کو گرہن لگنا (کسوف اور خسوف) بھی ان چیزوں کے مخلوق ہونے اور خالق کائنات کے مقابلے میں محدود ہونے کی ایک اور نشانی ہے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ چیزیں بجائے خود دوسری موجودات کو اپنے نور سے فیضیاب کرنے کا رتی بھر اختیار نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کوئی دوسری چیز ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور انہیں اپنا کام انجام دینے سے روک دیتی ہے۔

لہٰذا سورج اور چاند کو گرہن لگنا ان کے مخلوق ہونے اور قادرِ مطلق کے

---

[1] سورۂ انعام۔ آیات ۷۶ تا ۷۸

مقابلے میں محدود ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

جب ہم سورج گرہن اور چاند گرہن کے حادثے سے دوچار ہوں (ایک ایسا حادثہ جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ اجرام فلکی ایک قوی اور غالب ارادے کے محکوم ہیں۔ ایک ایسا حادثہ جو ہمارے دلوں میں اس خالقِ حقیقی کے بارے میں ایمان اور اعتراف پیدا کرتا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سورج اور چاند سمیت ساری کائنات ہے) تو ہمارے لیے مناسب اور ضروری ہے کہ اس وقت اپنے دلی ایمان کو عمل کے سانچے میں ڈھالیں اور نمازِ آیات پڑھ کر اور اپنی پیشانی پروردگار عالم کے آستانۂ قدسی پر رکھ کر اپنے باطنی عقیدے اور اعتراف کا اظہار کریں۔

چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان درخشندہ اجرام فلکی کے غروب ہونے پر اسی نتیجے پر پہنچے جو ہم نے سورج گرہن اور چاند گرہن سے نکالا ہے تو آپ نے فوراً فرمایا:

"اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ" (سورۂ انعام آیت ۸۰)

"میں نے اپنا منہ اس کی طرف پھیرا ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے ہیں۔ میں اسے خلوص سے یاد کرتا ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔"

(۲) علاوہ ازیں ان صورتوں میں جب کہ آسمان میں نئی نئی اور بعض اوقات وحشت ناک اور غیر معمولی کیفیات رونما ہوں اکثر لوگ کئی ایک توہم پرستانہ امور میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور ان اعمال کو اس حادثہ کے رفع کرنے کے لیے مؤثر خیال کرتے ہیں۔

اسلام نے سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت نمازِ آیات کا پڑھنا واجب قرار دے کر لوگوں کو اوہام اور خرافات کی جانب متوجہ ہونے سے باز رکھا ہے اور ان کی عقلوں اور سوچ بچار کو اس نقطے کی طرف متوجہ کیا ہے

جو کائنات کے تمام حوادث کا سرچشمہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ نماز انسان کو ان وحشت ناک حوادث کے مقابلے میں اطمینان اور دلی سکون بخشتی ہے۔

عورت کو نماز کی حالت میں اپنا بدن کیوں ڈھانپنا چاہیے؟

سوال: جب خدا ہر چیز کے ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے تو پھر عورتوں کے لیے نماز کی حالت میں بدن کا ڈھانپنا کیوں ضروری ہے؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا ہر چیز سے ہر حالت میں باخبر ہے اور پوشیدہ اور پنہاں اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ وہ اپنے بندوں سے نامحرم بھی نہیں ہے تاہم انسان عبادت کے وقت اپنے آپ کو خدا کے حضور میں دیکھتا ہے، اس سے ہمکلام ہوتا ہے اور رازو نیاز کرتا ہے۔ اسے چاہیے کہ اس حالت میں خدائے بزرگ کے حضور میں مناسب ترین لباس پہنے اور ظاہر ہے کہ عورت کے لیے مناسب ترین لباس کامل لباس ہی ہو سکتا ہے یعنی وہ لباس جو اس کی عفت اور پاکدامنی کی علامت ہو اور اس کے بہترین حالات کی عکاسی کرے۔ عبادت کی حالت میں فقط ایسا لباس ہی موزوں ہوتا ہے۔

مردوں کے لیے بھی نہ صرف یہ کہ ننگے بدن کے ساتھ نماز پڑھنا باطل اور خضوع کی روح اور خدائے قدوس کی بندگی اور احترام کے منافی ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ واجب مقدار میں پوشش کے علاوہ ایسے لباس کے ساتھ نماز پڑھی جائے جو بے حد احترام کی علامت ہو مثلاً فقط زیر جامہ پہن کر نماز پڑھنا ٹھیک نہیں بلکہ زیر جامے کے علاوہ اوپر والا لباس بھی پہننا چاہیے۔

الکحل سے تیار کردہ مشروبات کیوں نجس ہیں؟

سوال: علماء نے اپنے رسالوں میں الکحل سے تیار شدہ مشروبات کو نجس کیوں قرار دیا ہے جب کہ الکحل بہت سی اشیاء کو وبائی اثرات سے پاک کرتی ہے اور بہت سے جراثیم کا خاتمہ کرتی ہے۔ اس کے باوجود اس کے نجس ہونے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اصولاً جو چیزیں اسلام میں نجس اور ناپاک قرار دی گئی ہیں ان کی مختلف وجوہات ہیں۔

ان میں کچھ چیزیں چونکہ اپنی ماہیت کے لحاظ سے ناپاک اور پلید ہیں اور ان سے بہت سی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں (مثلاً پیشاب اور خون وغیرہ) لہٰذا اسلام نے انہیں نجس قرار دیا ہے اور ان سے لازمی طور پر اجتناب برتنے کو کہا ہے۔

دوسرے زمرے میں وہ چیزیں آتی ہیں جو ظاہری طور پر نہیں لیکن باطنی طور پر پلید ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انہیں ناپاک شمار کیا ہے مثلاً کفار —— ممکن ہے کہ کافر بظاہر پاک اور صاف ستھرا ہو لیکن جیسا کہ سترھویں سوال کے جواب میں بتایا جائے

گا چونکہ وہ عقائد کے لحاظ سے گمراہ ہے لہٰذا روحانی طور پر ایک ایسی نجاست کا حامل ہے جو بدن کی صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے دور نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کی غرض سے اسلام نے کافروں کو ناپاک شمار کیا ہے تاکہ مسلمانوں کو ان سے مکمل طور پر گھل مل جانے سے روکا جاسکے اور اس روک تھام کی بدولت ان کی روحانی پاکیزگی محفوظ رہے۔ اگر کفار کو ناپاک قرار نہ دیا جاتا اور ان سے ہر قسم کے میل جول کی اجازت دے دی جاتی تو ممکن تھا کہ بہت سے ضعیف الاعتقاد لوگ ان کے خیالات اور اقوال سے متاثر ہوجاتے۔[1]

علاوہ ازیں کفار سے مکمل میل جول ان کے اسلامی معاشروں میں نفوذ اور نوآبادیاتی منصوبے بروئے کار لانے کا موجب بنتا ہے تاہم ان کی طرف سے پیدا ہونے والے خطرات کا سدباب کرنے کی جانب پوری توجہ دیتے ہوئے ان سے تجارتی اور علمی تبادلوں کی بنیاد پر محدود پیمانے پر رابطہ قائم کرنا ممنوع نہیں اور اسی لیے اسلام نے اس پر پابندی عائد نہیں کی۔

تیسرے زمرے میں وہ چیزیں آتی ہیں جن میں مذکورہ بالا اقسام کی نجاستیں نہیں ہوتیں لیکن وہ بہت سی اجتماعی اور انفرادی خرابیوں کا سرچشمہ ہوتی ہیں مثلاً الکحل سے تیار ہونے والے مشروبات۔

یہ درست ہے کہ الکحل اجسام کو وبائی اثرات سے پاک کرتی ہے لیکن الکحلی مشروبات کا پینا بہت سی خرابیوں کا موجب ہے۔ اسلام نے ان خرابیوں کی روک تھام کے لیے اسے نجس قرار دیا ہے تاکہ اس وسیلے سے اس کے استعمال پر بندش عائد کرے اور نتیجے کے طور پر لوگوں کو اس سے دور رکھے کیونکہ یہ امر بدیہی ہے کہ اگر کوئی چیز ناپاک اور نجس ہو تو ایک مسلمان کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے پرہیز کرے اور اپنی زندگی اس سے آلودہ نہ کرے اور یہی بات اس کے اس چیز سے دوری اختیار

---

[1] جلد ہی ہم کفار کے ناپاک ہونے کے فلسفے پر گفتگو کریں گے۔

کرنے کا موجب بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ الکحل سے تیار شدہ مشروبات کے عدم استعمال کے سلسلے میں یہ نفرت اور کراہت بڑا گہرا اثر رکھتی ہے اور یہ بجائے خود ایسے مشروبات کے خلاف ایک قسم کی سنجیدہ جنگ ہے۔ [۱]

---

[۱] الکحل کے نجس ہونے کے بارے میں اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق الکحل سے تیار کردہ مشروبات سے ہے لیکن صنعتی الکحل کا نجس ہونا۔ علمائے دین اور فقہا کے مابین مورد بحث ہے کیونکہ اس قسم کی الکحل عموماً پینے کے قابل نہیں ہوتی بلکہ ایک زہریلا مادہ شمار کی جاتی ہے۔

پسینے اور پیشاب میں کیا فرق ہے ؟

سوال: پیشاب اور پسینہ دونوں زائد مواد کی شکل میں خارج ہوتے ہیں پھر ان میں سے ایک نجس اور دوسرا پاک کیوں ہے ؟ جب کہ کہا جاتا ہے کہ دونوں کی کیمیائی ترکیب ایک دوسرے کے مشابہ ہے ؟

جواب: یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگرچہ پیشاب اور پسینہ کیمیائی ترکیب کے معاملے میں کئی ایک لحاظ سے باہم مشابہ ہیں لیکن کئی ایک لحاظ سے ان کے مابین فرق بھی ہے اور ممکن ہے کہ ترکیب کے اسی لحاظ سے ان کے بارے میں دو مختلف حکم دیے گئے ہوں کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھیں گے پیشاب میں زہریلے مواد کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے جو پسینے میں نہیں ہے۔ اس قول کی توضیح ذیل میں کی جاتی ہے۔
پیشاب کی ترکیب میں مندرجہ ذیل مواد موجود ہے:

UREA
URIC ACID
CREATININE
AMMONIA
SODIUM CHLORIDE

CALCIUM
POTASSIUM
PHOSPHATE
SULPHATES

جبکہ پسینے کی ترکیب میں موجود اجزاء نسبتاً کم ہوتے ہیں۔

اتفاقاً جو پسینہ جلد کے مساموں سے خارج ہوتا ہے وہ فوراً جلد کی سطح پر بخار بن جاتا ہے اور یہ تبخیر بدن کی سطح پر جراثیم کی نشوونما کو روکتی ہے جبکہ عین ممکن ہے کہ مختلف قسم کے جراثیم پیشاب میں باقی رہ جائیں۔ اس بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے مقدس آئین میں بدن کے پسینے کو پاک اور پیشاب کو نجس کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے:

(۱) رنگین مواد اور جو فقط پیشاب کی کیمیائی ترکیب میں وجود رکھتے ہیں زہر ہیں اور ان کے زہریلے پن کا درجہ زیادہ ہے اور ایسا مواد بدن کے پسینے کی ترکیب میں نہیں ہوتا۔

(۲) پیشاب میں Urea کی مقدار جو بجائے خود زہریلا پن رکھتا ہے پسینے کے Urea سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

(۳) چونکہ پسینہ جلد کی سطح پر بخار بن جاتا ہے اس لیے وہ جلد پر جراثیم کی نشوونما کے لیے کوئی موقع باقی نہیں چھوڑتا۔

(۴) کئی ایک لحاظ سے پیشاب کا آمیزہ پسینے کے آمیزے سے تقریباً دس گنا گاڑھا ہوتا ہے اور یہی فرق ایک کو پورے طور پر مضر اور دوسرے کو بے ضرر قرار دے سکتا ہے۔

اور ان سب باتوں کے علاوہ پسینے سے بچنا بہت مشکل اور پریشانی کا موجب ہے جبکہ پیشاب سے بچنا کسی طور بھی مشکل نہیں اور یہ خود ان کے مابین ایک اور فرق ہے۔

مُردوں کو غسل دینے اور غسل مسِ میت کا فلسفہ کیا ہے؟

سوال: مُردوں کو غسل دینے اور جس شخص نے میت کو مس کیا ہو اس کے غسل کرنے کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ اگر کوئی مر جائے تو شرعِ مقدسِ اسلام کے مطابق ضروری ہے کہ اسے ایک خاص طریقے سے نہلایا جائے اور اگر اسے غسل دینے سے پہلے کوئی شخص اس کے بدن کو چھولے تو اس کے لیے بھی غسل کرنا واجب ہے؟

جواب: جیسا کہ ہم نے کئی دفعہ کہا ہے اسلام کے کچھ فروعی احکام کا فلسفہ ہم پر واضح نہیں ہے لیکن وقت کے گزرنے اور عقلِ انسانی کے ارتقا اور علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کچھ مسائل کا فلسفہ روشن ہو گیا ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ کچھ اور مسائل کے اسرار روشن اور واضح ہو جائیں۔

زیر بحث سوال میں جو نکتہ اٹھایا گیا ہے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ غسلِ میت کے لازم قرار دیے جانے کے اسرار میں سے ایک یہ ہے کہ تمام اقوام جس طرح زندہ لوگوں کا احترام ضروری سمجھتی ہیں اسی طرح مُردوں کے لیے بھی خاص احترام کی

قائل ہیں۔

اگرچہ اسلام نے مُردوں کے بارے میں گزشتہ امتوں اور قوموں کی ایسی رسوم کو جو اوہام پرستی کا پہلو لیے ہوئے تھیں حذف کر دیا ہے لیکن وہ مُردوں کے لیے غسل، کفن اور دفن کی شکل میں احترام کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس بنا پر میت کا غسل اور دوسری رسوم مُردوں کے لیے ایک قسم کا پاکیزہ احترام ہے۔

دوسرے الفاظ میں اسلام انسان کی غیر معمولی قدر و قیمت کا قائل ہے اور اس نے مختلف وسائل اور بیانات کے ذریعے اس کی قیمت کو دو بالا کیا ہے حتیٰ کہ یہ صورت موت کے بعد بھی انسان کے شامل حال رہتی ہے اور اسلامی قوانین کی رو سے کوئی شخص ایک مسلمان میت کی اہانت کرنے کا مجاز نہیں بلکہ اس کی قبر کی بے حرمتی بھی نہیں کر سکتا۔

مُردوں کا غسل، کفن اور دفن بھی انسان کے رتبے کے احترام کی ایک صورت ہے۔ ایسا احترام جس میں اوہام پرستی کا عنصر شامل نہیں۔

علاوہ ازیں چونکہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے موت زندگی کا مکمل خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی دنیا، نئی زندگی اور خدا کے جوارِ رحمت میں پہنچنے کے لیے ایک دروازہ ہے اس لئے وہ حکم دیتا ہے کہ مُردوں کو پاک صاف کیا جائے اور ایک سادہ اور پاک لباس پہنا کر سپردِ خاک کر دیا جائے تاکہ یہ عمل حقیقی زندگی کی بقا اور دوام کی نشانی بن جائے۔ یہ ہے غسلِ میت کا فلسفہ۔

اب رہا مسئلہ غسلِ مسِ میت کا۔ اس سے پیشتر کہ ہم اس کا اصلی جواب دیں چند نکتوں کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) جب کوئی مر جائے تو اس کے پسماندگان کے احساسات اور جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اچانک اس سے اپنا رابطہ منقطع ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں اس سے جو انس اور تعلق ہوتا ہے اس کی بنا پر اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اسے چومنا اور اپنی محبت بھری آغوش میں لینا چاہتے ہیں۔

۲ یہ نکتہ بھی بالکل واضح ہے کہ بیماری کے زیر اثر یا دفاعی قوت ختم ہو جانے کی وجہ سے مختلف قسم کے زہر پیدا ہو جانے کی بنا پر عموماً مردہ شخص کا بدن کئی قسم کے جراثیم سے آلودہ ہو جاتا ہے اور حفظانِ صحت کے لحاظ سے اس کے قریب جانا بہت سے خطرات کا موجب ہوتا ہے۔

۳ اسلام نے کبھی بھی انسانی جذبات اور احساسات کے خلاف جنگ نہیں کی اور نہ ہی ان کے فطری محرکات کو نظر انداز کیا ہے بلکہ جذبات اور احساسات کی ایک خاص راستے کی جانب ہدایت اور رہنمائی کی ہے۔

مندرجہ بالا نکات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ:

تمام لوگوں کو اور بالخصوص مرنے والے کے لیسماندگان کو مختلف قسم کے جراثیم اور ایسی گوناگوں بیماریوں سے بچانے کے لیے جن کا میت کے بدن سے خود ان میں سرایت کرنا ممکن ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس غرض سے کہ مردے کو چھونا حرام قرار دے کر ان کے برافروختہ جذبات اور احساسات کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے۔ اسلام نے ان کے لیے ایک شرعی شرط عائد کر دی ہے یعنی حکم دیا ہے کہ جو شخص بھی میت سے اتصال پیدا کرے اسے چاہیے کہ غسل کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شرعی شرط جہاں زندہ لوگوں کے مُردوں سے اتصال کو کافی حد تک محدود کر دیتی ہے وہاں ان کے جذبات اور احساسات کو بھی نظر انداز نہیں کرتی اور جب اس شرعی شرط کے ہوتے ہوئے لوگ مردے کے بدن کو چھوئیں تو غسل مس میت بجائے خود بدن دھونے اور ممکنہ جراثیم کو دور کرنے کا بہترین اور سادہ ترین طریقہ ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ اعتراض اٹھائیں کہ جب غسل مسِ میت کے ذریعے ایک شرعی شرط عائد کی گئی ہے اور اس کا مقصد آلودگی اور بیماریوں میں مبتلا ہونے کی روک تھام کرنا ہے تو پھر مردے کو غسل دینے کے بعد اس سے اتصال پیدا کرنا اور چھونا غسل کا موجب کیوں نہیں ہوتا؟ لیکن یہ اعتراض سطحی معلوم ہوتا ہے اور اس کا جواب واضح ہے کیونکہ مردے کو بیری کے پتوں سے مخلوط پانی اور کافور ملے ہوئے پانی

اور خالص پانی سے غسل دینا بجائے خود مردے کو وبائی اثرات سے پاک کرنے اور صاف ستھرا کرنے کا ایک موثر عامل ہے اور اس کی وجہ سے کم از کم کچھ مدت کے لیے جو خطرات غسل سے پہلے موجود ہوں وہ باقی نہیں رہتے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مذکورہ بالا رسوم انجام دینے کے بعد تھوڑی سی مدت کے اندر میت کو دفن کر دیا جاتا ہے اور نئے جراثیم کی پیدائش اور ان کے انسان میں سرایت کرنے کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

مُردوں کے غسل اور مس میت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ احکام کے فلسفے کا ایک پہلو ہے۔ ممکن ہے اس کے کئی ایک اور نکات بھی ہوں جو فی الحال ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں۔

ناجائز بچے بعض مناصب سے کیوں محروم ہیں؟

سوال: اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ جو بچے ناجائز تعلقات کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں ان کا اپنے ماں باپ کے عمل میں کوئی دخل نہیں ہوتا اور وہ کسی گناہ اور معصیت کے مرتکب نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی روایات میں ناجائز بچوں کو مختلف طریقوں سے برا بھلا کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دی گئی کہ کئی ایک اہم اجتماعی مشاغل اور مناصب مثلاً قضاوت، امامتِ جماعت اور فتویٰ کو اپنائیں۔

یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص جو کسی گناہ کا مرتکب نہ ہوا ہو محض اپنے والدین کے مجرم اور گناہگار ہونے کی بنا پر اس قدر لعنت ملامت کا سزاوار ٹھہرے اور اس حد تک خوش بختی اور اہم اجتماعی مناصب پر فائز ہونے سے محروم قرار پائے؟

اس کے علاوہ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسے بچے نہ تو بہشت کے

حقدار ٹھہرتے ہیں اور نہ ہی نیک بختی کا منہ دیکھتے ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خداوندِ حکیم ایک شخص کا گناہ دوسرے کے حساب میں نہیں لکھے گا؟

"وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" (سورۂ انعام آیت ۱۶۴)

جواب: اس سے پیشتر کہ ہم اصل جواب دیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل نکات پر گفتگو کریں جو اس بحث کی بنیاد تشکیل دیتے ہیں اور پھر ان سے نتیجہ حاصل کریں۔

(۱) چونکہ ناجائز جنسی تعلقات باپ اور فرزند کے درمیان قانونی رشتہ اور مالی روابط ختم کر دیتے ہیں لہٰذا وہ ان خاندانی تعلقات اور جذبات کی جڑ کاٹ دیتے ہیں جو معاشرے کی تشکیل کی بنیاد ہیں۔ بعض اوقات تو ایک زناکار عورت کو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس مرد کے نطفے سے حاملہ ہوئی ہے۔ اس طرح ایک ناجائز بچہ اپنے باپ، دادیوں، نانیوں اور عزیزوں رشتہ داروں کو نہیں پہچانتا اور بالعموم بیسیوں ایسی اخلاقی، نفسیاتی، معاشرتی، تربیتی، خاندانی، مالی اور جذباتی خرابیاں ہیں جو زنا کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس امر کا باعث ہوئی ہیں کہ انبیائے کرامؑ اور اسی طرح انسانی قوانین وضع کرنے والوں نے عفت کے منافی اعمال کو حرام قرار دیتے ہوئے شرعی طور پر ناجائز جنسی تعلقات کے ممنوع اور غیر قانونی ہونے کا اعلان کیا ہے۔

(۲) چونکہ ہر معاشرے اور قوم میں شادی بیاہ کے لیے قواعد و ضوابط موجود ہیں لہٰذا ناجائز جنسی تعلقات قائم کرنا ایک خلافِ قانون اور جارحانہ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمل کا ارتکاب کرنے والوں کو اپنے اندر ایک قسم کے گناہ اور اضطراب کا احساس ہوتا ہے جس کا سرچشمہ گناہگاری کی روح اور برے نتائج ہوتے ہیں جن کا اس عمل سے پیدا ہونے کا امکان ہو۔

اور جب اس عمل کی تکرار یا دوسرے عوامل کی بنا پر تشویش کی اس حالت میں کمی واقع ہو جائے اور زناکار شخص کو بظاہر تشویش کا احساس نہ ہو تب بھی اس کے باطنی ضمیر میں ایک بہت بڑا چور موجود ہوتا ہے اور وہ بدتمیزی، جرم قانون شکنی اور انحراف کے بارے میں سوچ بچار ہے۔

(۳) وراثت کے مسلمہ قانون کے مطابق دوسرے بدنی اور جسمانی اثرات کی طرح ماں باپ کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیات بھی اولاد کو منتقل ہو جاتی ہیں۔ جس طرح والدین کی جسمانی خصوصیات مثلاً آنکھوں کی رنگت، بالوں کی سیاہی، بھوؤں کی پیوستگی اور بدن کی خصوصیات عموماً وراثت کی شکل میں فرزندوں کو منتقل ہو جاتی ہیں، اسی طرح ان کی نفسیاتی اور اخلاقی کیفیات مثلاً تندخوئی، سادہ دلی، اخلاص، غصہ اور سرکشی وغیرہ بھی وراثت کے ذریعے فرزندوں کو منتقل ہو جاتی ہیں۔

درحقیقت یہ وراثت ہی ہے جو افراد کے مستقبل کی بنیاد رکھتی ہے اور انسانوں کی شخصیت کے ایک قابلِ توجہ حصے کی تعمیر کرتی ہے اور ان کی خوش بختی اور بدبختی کے لیے میدان ہموار کرتی ہے۔

مندرجہ بالا نکات سے ہم جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ:

ناجائز بچے اپنے والدین سے سرکشی، بدتمیزی، قانون شکنی اور گناہ کا جوہر اس حد تک ورثے میں پاتے ہیں کہ ان کے لیے جرم اور گناہ کے ارتکاب کا میدان زیادہ ہموار ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں گناہ کے ارتکاب کے لیے زیادہ تیار رہتے ہیں لہٰذا اگر انہیں شخصی طور پر غلط تربیت ملے یا ماحول نامناسب ہو تو یہ بات اس امر کے لیے کافی ہے کہ ان کی آلودہ اور ناکارہ روح کی اصلیت جو راکھ کے نیچے آگ کی مانند چھپی رہی ہو ظاہر ہو جائے اور ان کی خوش نصیبی اور نیک بختی کے خرمن کو جلا کر رکھ دے۔

جہاں تک ناجائز طور پر جنم لینے والے لوگوں کے اجتماعی عہدوں سے محروم ہونے کا سوال ہے جو کچھ ان لوگوں کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں اوپر بیان ہوا ہے اس کے

اور اس بات کے علاوہ کہ یہ عمل قومی مفاد کی حفاظت کے لیے ایک قسم کی معقول احتیاط تصور ہوتا ہے۔ اسلام اس قسم کے نازک اجتماعی عہدوں پر فائز ہونے کے لیے عمومی اعتماد کے حصول کو بھی اہمیت دیتا ہے لہٰذا اس نے ایسے لوگوں کو جن کی خاندانی حیثیت میں نقائص ہوں یا جن کے سوابق ناپسندیدہ ہوں ایسے عہدوں سے محروم کر دیا ہے جن کے لیے روحانی طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن اس معاملے میں غلطی نہیں کھانی چاہیے کیونکہ ان تمام کیفیات کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ فقط کسی شخص کا ناجائز اولاد ہونا اس کی بے راہ روی اور شقاوت کے لیے علت تامہ ہو اور صحیح اسلامی تعلیم اور تربیت حاصل کرنے کا ارادہ اور اختیار اس سے مکمل طور پر چھین لیا گیا ہو اور وہ زندگی کے صحیح اصولوں پر عمل پیرا ہو کر بھی خوش بختی کا اہل نہ بن سکے، نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔

ناجائز طور پر جنم پانے والے لوگ بھی فطری اور قانونی اولاد کی طرح بھلائی یا برائی کے راستے کے انتخاب میں آزاد ہیں۔ وہ بھی اپنے ارادے اور اختیار کی بدولت تقویٰ اور فضیلت کا راستہ اپنا کر نجات پانے والوں اور اہلِ بہشت میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ فطری طور پر شریر اور مجرم پیدا ہوئے ہوں اور کسی طرح بھی پلیدی اور گناہ کے چنگل سے رہائی نہ پا سکتے ہوں بلکہ جیسا کہ امام صادقؑ نے فرمایا ہے:

"اِنَّ وَلَدَ الزِّنَا يَسْتَعْمِلُ اِنْ عَمِلَ خَيْرًا اُجْزِيَ بِهٖ وَاِنْ عَمِلَ شَرًّا اُجْزِيَ بِهٖ"

ناجائز فرزند تربیت کے لیے کام کرنے اور اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمال اچھے ہوں تو اسے نیک جزا ملتی ہے اور اگر وہ برے اور ناپسندیدہ کام انجام دے تو اپنی نافرمانی کی سزا بھگتے گا۔

اگرچہ ناجائز فرزندوں کی سرکش طبیعت (جو کہ گناہ اور قانون شکنی سے زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں) گناہ کے خلاف جنگ کے سلسلے میں ان کے لیے فریضے کی ادائیگی

کو زیادہ کٹھن بنا دیتی ہے لیکن اگر وہ اپنے باطنی میلان کے برخلاف خدا کے احکام اور زندگی کے صحیح اصولوں کی پیروی کریں تو ــــ "افضل الاعمال احمضھا" ــــ کے حکم کے مطابق (یعنی بہترین کام وہ ہیں جو محنت اور مشقت کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں) انہیں بہتر اور گرانبہا جزا دی جائے گی۔

پس اسلام ناجائز فرزندوں کو جو ملامت اور سرزنش کرتا ہے وہ محض اس لیے ہے تاکہ انہیں خبردار کیا جائے کہ وہ بڑی خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہیں اور انہیں چاہیے کہ وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے اور گناہوں سے بچنے کے سلسلے میں پوری پوری احتیاط برتیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ تعلیم و تربیت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور وہ یقیناً دوزخ میں جائیں گے۔

دوسرے الفاظ میں وہ فرزند جو ناجائز تعلقات کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں ان بچوں کی مانند ہیں جو بیمار والدین (مثلاً سل اور جنسی امراض وغیرہ کے مریض) کے ہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں کے ان امراض میں مبتلا ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے اور اگر ان کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو ان کے جلد ہی بیمار پڑ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی مفاد کی رعایت کرتے ہوئے اور لوگوں کا اعتماد بحال کرنے کی خاطر ایسے بچوں کو جنہیں مثلاً سل کی بیماری کا خطرہ لاحق ہو خوراک وغیرہ سے متعلقہ کاموں کی ذمہ داری نہیں سونپنی چاہیے۔

بیمار والدین کے بچوں کی طرح ناجائز فرزند بھی قانون شکنی گناہ اور جرم کے لیے ایک طرح کی آمادگی رکھتے ہیں۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت صحیح، ماحول صحت مند اور ارادہ مستحکم نہ ہو تو ممکن ہے کہ وہ پستی میں گر کر جرائم پیشہ لوگوں میں شامل ہو جائیں۔ ان وجوہات کی بنا پر عوامی مفادات کا تقاضا ہے کہ وہ لازمی اجتماعی احتیاط کی رعایت کرتے ہوئے بعض عہدوں کی ذمے داریاں سنبھالنے سے باز رہیں۔

البتہ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ ناجائز فرزند قطعاً نیک بختی اور نجات سے بہرہ ور نہ ہوں گے بالکل غلط ہے بلکہ وہ بھی دوسروں کی طرح خوش قسمت اور سعادت مند

افراد بن سکتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں چونکہ ان کا روحانی پس منظر دوسروں کے مقابلے میں ناموافق ہوتا ہے لہٰذا انہیں قوی تر اور بیشتر احتیاط اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے یہ ضروری نہیں کہ ایک مدقوق شخص کا فرزند یقیناً مدقوق ہو بلکہ حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کر کے اسے دوسروں سے زیادہ طاقتور بنایا جا سکتا ہے اور اس بیماری سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ بدبختی کے لیے میدان ہموار ہونا اس بات کی قطعی دلیل نہیں کہ انسان اس میں مبتلا ہو گا بلکہ قوی ارادے اور تربیت سے اس کا سدِّ باب کیا جا سکتا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اگر ایسے ناجائز فرزند گناہ کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں تو وہ اپنے جیسے ہم رتبہ لوگوں کے مقابلے میں بہتر اور بلند تر مقام حاصل کریں گے کیونکہ انہوں نے زیادہ ریاضت کی ہو گی۔

صحت کے لیے سوّر کے گوشت کے مضر اثرات

سوال: سوّر کا گوشت کھانے میں کیا خرابی ہے کہ اسلام نے اس کی ممانعت کی ہے حالانکہ عیسائی تو بہیں اسے بڑی رغبت سے کھاتی ہیں؟

جواب: دورِ حاضر میں یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سوّر کا گوشت اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے جتنا خطرناک اسے تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے استعمال کرنے والوں کو اس بنا پر جو خطرات لاحق ہوتے ہیں وہ کئی ایک ہیں۔ یہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ہوتے ہیں جو اندرونی افراز Hormones کے ذریعے صورت پذیر ہوتے ہیں اور حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں ہم اس کی صحت کے لیے فقط ایک مضرت کی جانب اشارہ کریں گے جو Trichinose نامی ایک مخصوص بیماری ہے جس کا تاحال کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا اور لطف کی بات یہ ہے کہ جو کچھ آپ ذیل میں پڑھیں گے وہ امریکہ کے ایک علمی مرکز کا مقالہ ہے جو ڈاکٹر محمد غفرانی صاحب کے توسط سے ہمارے لیے ارسال کیا گیا ہے۔

سوّر سے پیدا ہونے والی ایک خطرناک بیماری

حفظانِ صحت کے بہت سے اداروں کو ڈاکٹروں سے ایسے مریضوں کے بارے میں رپورٹیں موصول ہوئی ہیں جو Trichinosis کی بیماری میں بڑی شدت سے مبتلا ہیں اور اب یہ رپورٹیں کسی حد تک یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس بیماری نے وبا کی شکل اختیار کر لی ہے یعنی قاعدے کے مطابق اس بیماری کے جتنے واقعات معاشرے میں ہونے چاہئیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔

Trichinosis ایک عام بیماری ہے جو بال کی شکل کے ایک چھوٹے سے کیڑے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو بذاتِ خود مٹی کے کیڑوں کی ایک قسم ہے۔ یہ کیڑا اپنی زندگی سوّر اور کچھ دوسرے حیوانات کے بدن میں گزارتا ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ہر دودھ پلانے والا جاندار ان کیڑوں سے آلودہ سوّر کا گوشت کھانے سے خود اس مرض میں مبتلا ہو جائے لیکن اس سلسلے میں انسان کی حساسیت کہیں زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر ریچھ کو سوّر کے بدن کے انتڑیوں جیسے اجزا کھانے سے بہ آسانی یہ بیماری لگ جاتی ہے اور جو شکاری اور دوسرے افراد جو بیمار ریچھ کا گوشت استعمال میں لاتے ہیں وہ بھی باری باری اس بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عموماً انسان سوّر کا ایسا گوشت کھانے سے جو مکمل طور پر پکا ہوا نہ ہو اس بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ سوّر کا جو گوشت وہ استعمال کر رہا ہے وہ مکمل طور پر پکا ہوا ہے کیونکہ اب بھی سوّر کا گوشت کھانے کی وجہ سے رونما ہونے والے کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں کہ بظاہر استعمال سے پہلے اس گوشت کو جدید وسائل کے ساتھ اطمینان بخش طور پر پکایا گیا تھا اور خود مقالہ نویس آخر میں ان مطالب کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

پر مبنی ایک مطالعے سے پتا چلا ہے کہ جن ڈھائی کروڑ افراد نے اس طفیلی کیڑے کو اپنے بدن میں نشو و نما دی ہے ان میں سے صرف ایک دستے نے بیماری

کی علامتیں ڈاکٹری کے واضح طریقے کے مطابق ظاہر کی ہیں لیکن بیماری کے ہزاروں واقعات ایسے بھی ہیں جو ڈاکٹروں کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔

اسی طرح اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان ڈھائی کروڑ افراد میں سے جن کی آلودگی اس کیڑے کے بدن کے عضلات میں پیدا ہونے سے وقوع پذیر ہوئی ہے اور جو زیادہ تر ثابت ہو گئی ہے۔ سولہ ہزار افراد ایسے ہیں جنہوں نے اپنی بیماری مشخص اور واضح طور پر ہسپتالوں میں ظاہر کی ہے جن میں سے ۵٪ آلودگی کی شدت کی بنا پر فوت ہو گئے۔

کافر کیوں ناپاک ہے ؟

سوال: اس بات کے پیچھے کیا فلسفہ کارفرما ہے کہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے دوسرے مذاہب کے پیرو اور مختصراً "کفار" ناپاک ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھ سکتے حالانکہ صفائی اور حفظان صحت کی رعایت کرنے کے لحاظ سے وہ بعض مسلمانوں سے بہتر ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا یہ جواب دینا کہ ممکن ہے ان سے میل جول سے بدعقیدگی پیدا ہو اور وہ بعض اوقات اپنی بحث اور گفتگو اور فریب کاری سے ایک مسلمان کو گمراہ کر دیں یا یہ کہ بائیکاٹ کے ذریعے ایک غیر مسلم کو اسلام کی جانب متوجہ کیا جا سکتا ہے غلط ہے اور اس حربے کو ترک کر دینا چاہیے کیونکہ اسلام روشن خیال لوگوں کا مذہب ہے۔ یہ ایسے لوگوں کا مذہب نہیں جن کی آنکھیں اور کان بند ہوں۔

جواب: اولاً، یہ درست ہے کہ اسلام روشن خیال لوگوں کا مذہب ہے اور ایسے لوگوں کا نہیں جن کی آنکھیں اور کان بند ہوں لیکن اگر مقصد یہ ہے

کہ اسلام کسی خاص گروہ سے تعلق رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور اسلام تمام بنی نوع انسان کا دین ہے اور اگر مراد یہ ہے کہ روشن خیال اور دانا اشخاص اسلام کی عالی تعلیمات سے بیشتر بہرہ مند ہوئے ہیں تو یہ بات صحیح ہے لیکن یہ امر اس کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اسلام اپنے قوانین میں کم علم رکھنے والے یا ان پڑھ لوگوں کو نظر انداز کردے اور ان کے حال کی رعایت نہ کرے۔

اب ہم اصل سوال کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کفار کا ناپاک ہونا مسلمہ طور پر ایک قسم کی روحانی ناپاکیزگی اور باطنی آلودگی ہے جس کے آثار کی ان کے جسم میں بھی رعایت کی گئی ہے اور انہیں ناپاک قرار دینے کا ایک فائدہ بہت سے ایسے لوگوں کے عقائد کی حفاظت کرنا ہی ہے جو سرکش اور گمراہ لوگوں سے میل جول کا اثر بہت جلدی قبول کر لیتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں مصلحین نے عام لوگوں کو ہمیشہ یہ تاکید کی ہے کہ آلودہ، گمراہ اور سرکش لوگوں سے دوری اختیار کریں اور بالآخر اسلام نے اسی چیز کو کفار کے "ناپاک ہونے" کے حکم کی صورت میں بیان کیا ہے۔

ہم یہ بھی ملاحظہ کرتے ہیں کہ اسلام نے مقررہ شرائط کے تحت کفار کے ساتھ اقتصادی، تجارتی اور ان سے ملتے جلتے تعلقات قائم کرنے کی اجازت تو دی ہے لیکن اس امر کی اجازت نہیں دی کہ انہیں ہم پیالہ وہم نوالہ بنایا جائے، یا یوں کہیے کہ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان ان سے تعلقات قائم کر کے فائدہ اٹھائیں اور ساتھ ہی ان اعتقادی اور اخلاقی نقصانات سے بھی محفوظ رہیں جو گہرے میل جول کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کو پہنچ سکتے ہیں۔

یہاں غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ روشن خیال اور باعلم افراد جو اپنے لیے کفار سے میل جول کے نتیجے میں انحراف، گمراہی اور فسادِ اخلاق کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے ان لوگوں سے مکمل طور پر گھل مل کر رہ سکتے ہیں اور مذکورہ بالا حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اسلام کے احکام کوئی خصوصی پہلو نہیں رکھتے اور

اس مقصد کے حصول کے لیے کہ اس دین کی حدود محفوظ رہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس کے احکام عمومیت کی کیفیت کے حامل ہوں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو ہر شخص اپنے آپ کو باعلم قرار دے کر کفار سے میل جول قائم کرے گا اور حد بندی کا قانون بالعموم درہم برہم ہو کر رہ جائے گا (غور فرمائیں)۔

علاوہ ازیں تمام کافر افراد بہت سی آلودگیوں اور نجس چیزوں مثلاً سوٴر کے خون اور گوشت اور الکحل سے تیار شدہ مشروبات سے اجتناب نہیں کرتے اور قدرتی طور پر ان کی تمام زندگی ناپاک ہوتی ہے۔ ان آلودگیوں سے دور رہنے کی خاطر اسلام نے انہیں نجس قرار دیا ہے تاکہ جن مسلمانوں کا ان سے میل جول کی بنا پر آلودہ ہونے کا امکان ہو وہ ہر قسم کی آلودگی سے محفوظ رہیں۔

جزیے کا کیا مقصد ہے؟

سوال: رسول اکرمؐ کی بعثت کا مقصد لوگوں کی ہدایت اور انہیں سیدھا راستہ دکھانا ہے جس کا روحانیت سے چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن دوسری جانب اسلام کے قوانین میں ہم ایسے مطالب بھی دیکھتے ہیں جو اسلام کے اصلی مقصد (لوگوں کو سیدھی راہ دکھانے) سے ہم آہنگ نہیں ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

"اگر عیسائی اور یہودی جزیہ دینے پر تیار ہوں تو انہیں آزاد چھوڑ دو"

جب کہ جزیہ خود مادی امور کی جانب توجہ دینے کی ایک صورت ہے۔

اس کے علاوہ اسلام یہ اجازت کیونکر دیتا ہے کہ انہیں اس بات کی رغبت دلائے کہ وہ اپنے تحریف شدہ دین پر قائم رہیں۔

جواب: اسلام کی باعثِ فخر باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کسی کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ بادل ناخواستہ اس دین کو قبول کرے چنانچہ سورۂ بقرہ کی ۲۵۶ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ"

دین اسلام کے انتخاب میں اکراہ اور جبر نہیں ہے کیونکہ ہدایت اور گمراہی کے مابین فرق واضح ہو چکا ہے۔

اس ارشادِ ربانی کا فلسفہ بھی بالکل واضح ہے۔ چونکہ اسلام نے پہلے دن سے اپنی عام دعوت کی بنیاد منطق اور دلیل پر رکھی ہے اور خرافات اور توہمات کے خلاف جنگ میں اس کا واحد ہتھیار حقائق کی تشریح اور عمومی خیالات کا اظہار رہا ہے لہٰذا ایسا طاقتور ہتھیار رکھتے ہوئے جو روشن دل اور سمجھدار افراد کو اپنی جانب کھینچ لے اسے زور اور زبردستی کی کیا ضرورت ہے؟

اساسی طور پر عقیدے اور حقیقی ایمان کے لیے کچھ ایسی مبادیات اور مخصوص بنیادوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر انسان انہیں ادراک، بصیرت اور اختیار کے ساتھ حاصل نہ کرے تو ان کا دل میں جگہ پکڑنا محال ہے اور اگر کبھی اس پر زبردستی کوئی عقیدہ ٹھونس بھی دیا جائے تو وہ زبان کے دائرے سے نہیں نکلتا اور دل کی جانب راہ پیدا نہیں کرتا اور جب بھی جبر کے عوامل باقی نہ رہیں انسان اپنی پہلی حالت پر لوٹ جاتا ہے۔

ایسے افراد کا ایمان اسلام کے لیے بے سود ہے۔ اسلام لوگوں کو ایسی تربیت دینا چاہتا ہے کہ وہ مرتے دم تک مقدس اسلامی اصولوں کے پابند رہیں اور ایک لحظہ بھی ان سے غفلت نہ برتیں اور ایسا ایمان منطق، دلیل اور روشن خیالی کے بغیر میسّر نہیں آسکتا۔

اسلام میں جہاد کا مقصد اور دشمن کی جارحیت کا مقابلہ بجائے خود ایک ایسا مسئلہ ہے جسے جداگانہ طور پر موردِ بحث قرار دینا چاہیے۔ البتہ جہاں تک جزیے کا تعلق ہے یہ ایک فی کس ٹیکس تھا جو اہلِ کتاب ہر سال اسلامی حکومت کو ادا کرتے تھے اور اس ٹیکس کے عائد کرنے کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ ان علاقوں کا نظم و نسق مسلمان چلاتے تھے اور یہ دہ ایک اقلیت کی شکل میں اسلامی معاشروں میں زندگی بسر کرتے تھے لہٰذا اسلامی حکومت اس امر پر مجبور تھی کہ ان کی حفاظت، انتظام اور امن و امان کی ذمّے داری سنبھالے۔ اس لحاظ سے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ ہر اس شخص سے جس نے اسلام قبول نہ کیا ہو ایک عادلانہ ٹیکس

وصول کرے اور اسے ان کے وسائلِ زندگی کی فراہمی اور جان و مال کی حفاظت پر خرچ کرے۔

ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت لوگوں کے جان و مال کو ہر ممکنہ تجاوز سے محفوظ رکھنے کے لیے جو فوجی دستے ملک کے مختلف مقامات پر تعینات کرنے پر مجبور تھی ان پر کافی خرچ آتا تھا۔ اس خرچ کو پورا کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ خود لوگوں سے مال حاصل کرکے انہیں کی بہبود پر خرچ کیا جائے۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ جو جنگیں اسلام کے دشمنوں کے خلاف لڑی جاتی تھیں غیر مسلم ان میں شرکت کے لیے اپنے سپاہی میدان جنگ میں نہیں بھیجتے تھے۔

اس وقت بھی ہمارے پاس کئی مضبوط تاریخی ثبوت موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ ٹیکس ـــــ جس کی مقدار عموماً کم ہوتی تھی ـــــ غیر مسلموں پر دباؤ ڈالنے کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد انہیں لوگوں کے آرام و آسائش کے اسباب مہیا کرنا تھا۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

جب عبادہ بن صامت نے مصر کے فرمانرواؤں اور دوسرے قبطیوں کو دینِ اسلام کی دعوت دی تو ان سے کہا:

۱ـــ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے اگر چاہو تو مطالعہ اور غور و فکر کے بعد اسلام قبول کر لو اور اگر تم مسلمان نہ ہونا چاہو تو جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے زیر اقتدار زندگی گزار سکتے ہو۔ جب تک ہم ہیں اور تم ہو، ہم بہرحال تم سے ایسا سلوک کریں گے کہ ہم دونوں فریق ایک دوسرے سے راضی رہیں۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہاری جان، مال، گھروں اور زمینوں کی حفاظت کریں گے اور جو کوئی تمہارے مال میں تجاوز کرے گا، اس کے خلاف جنگ کریں گے۔

۲ـــ جب مسلمان رومیوں کے خلاف جنگ میں فتح یاب ہوئے اور شامات کے بہت سے علاقے ان کے قبضے میں آگئے تو حمص کے لوگ جزیہ دینے پہ تیار ہو گئے۔ بعد میں مسلمانوں نے چند وجوہ کی بنا پر یہ مناسب سمجھا کہ انہوں نے جو پیمان حمص کے عیسائیوں سے باندھا تھا اسے طرفین کی رضامندی سے فسخ کر دیں لہٰذا مسلمانوں

کے بزرگ سردار نے ایک عام مجمع میں حمص کے لوگوں سے یوں خطاب کیا:

"جو کچھ ہم نے تم سے لیا ہے وہ واپس لے لو اور ہم نے جو معاہدہ تم سے کیا ہے ہمیں اس سے آزاد کر دو۔"

حمص کے لوگوں نے جواب دیا:

"ہم ہرگز تم لوگوں سے جدا نہیں ہوں گے۔ تمہارا انصاف اور پرہیزگاری رومیوں کی روش سے کہیں بہتر ہے۔ (اگر تم قبول کرو تو) ہم اسلامی سپاہ کے ساتھ مل کر رومی لشکر کے خلاف جنگ لڑنے کو تیار ہیں۔"

۳ــــ رسول اکرمؐ نے نجران کے عیسائیوں کے لیے جزیے کی جو مقدار مقرر فرمائی تھی ہمارے مطلب کو ٹھیک طور پر واضح کرتی ہے کیونکہ یہ قرار پایا تھا کہ وہاں کے لوگ سالانہ تین ہزار حلّے (جن میں ہر حلّے کی قیمت چالیس درہم تھی) دو قسطوں میں ادا کریں گے۔ دو ہزار حلّے ماہِ صفر میں اور ایک ہزار ماہِ رجب میں دیے جانے تھے۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے اذرح کے لوگوں سے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ ہر سال سو دینار ادا کریں گے۔

مسلمہ طور پر دشمنوں سے ان لوگوں کی جان و مال کی نگہبانی اور حفاظت کے مقابلے میں ان رقوم کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔

احرام کا لباس

سوال: احرام کے لباس کے لیے یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ عام طور پر پہنے جانے والے اور سلے ہوئے کپڑوں پر مشتمل نہ ہو؟

جواب: مراسم حج کی ادائیگی اجتماعی عبادات میں سے ہے جس کا کامل تجرد اور پوری پوری آزادی سے انجام دینا ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے پیش نظر حج کے دوران کپڑے کے دو ٹکڑوں کا پہننا کافی قرار دیا گیا ہے اور رسمی اور عام لباس پہننے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وہ تفریق اور اختلاف اور بعض اوقات تفاخر اور برتری کی علامت ہوتے ہیں اور یوں بنی نوع انسان کی اس بہت بڑی آرزو نے عملی جامہ پہن لیا ہے کہ ایک دن انسان ایک دوسرے پر برتری جتانے کے تمام موہوم عوامل کو ترک کر دے گا۔

دوسرے الفاظ میں حج خدا کی بارگاہ میں انسانوں کی برابری کی عالی ترین تجلی گاہ ہے اور اسی لیے ضروری ہے کہ ہر اس رسمی اور

عام لباس سے اجتناب برتا جائے جس سے امتیاز کا اظہار ہوتا ہو اور ہر قسم کے فرق اور امتیاز سے مبرا کپڑے کے دو ٹکڑوں پر اکتفا کیا جائے اور سب لوگ ان عظیم مراسم میں یکساں اور یک رنگ ہو کر شرکت کریں۔

قربانی کا گوشت تلف کیوں ہو جاتا ہے؟

سوال: عید قربان کے دن منیٰ کی سرزمین میں قربانی کا مقصد کیا ہے جب کہ بہت سی قربانیاں صحیح طور پر استعمال میں نہیں آتیں اور مٹی میں دفن ہو جاتی ہیں؟

جواب: جیسا کہ ہم جانتے ہیں دسویں ماہ ذی الحجہ کے اعمالِ حج میں سے ایک عمل منیٰ میں ایک حیوان کی قربانی دینا ہے۔ یہ اسلام کا ایک مسلّم فریضہ اور صریح حکم ہے اور اس کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یاد تازہ کی جائے۔

حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی قربانی کا واقعہ یہ ہے کہ خدا نے آپ کی روح کی تکمیل اور آپ کی فداکاری کی اہلیت اور مرتبہ ثابت کرنے کے لیے آپ کو حکم دیا کہ آپ اپنے غیر معمولی طور پر عزیز فرزند کو منیٰ کی سرزمین میں خدا کی راہ میں قربان کر دیں۔ بلاشبہ یہ حکم آزمائشی پہلو رکھتا تھا اور اس کا مقصد اس مردِ خدا کی صلاحیت ثابت کرنا تھا لہٰذا جب حضرت ابراہیمؑ نے فرمانِ الٰہی کی بجا آوری میں، بہ خیال خود اپنے بیٹے کو ذبح کر دیا اور آنکھوں سے پٹی

بنائی تو اسماعیلؑ کی بجائے ایک ذبح شدہ دنبہ پڑا پایا۔

حضرت ابراہیمؑ کے خدا کے حکم کی اطاعت پر آمادہ ہونے نے یہ ثابت کر دیا کہ اخلاص، اطاعت، جانبازی اور فداکاری کی روح ان میں اتنی قوی اور طاقتور تھی کہ وہ انتہائی گہرے پدرانہ جذبات اور احساسات پر بھی قابو پا سکتے تھے۔

خانۂ خدا کے زائرین سرزمین منیٰ میں ایک حیوان ذبح کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اخلاص اور قوتِ ایمانی اور جذبۂ قربانی کی یاد اپنے دلوں میں زندہ کرتے ہیں اور اس طریقے سے ایک دوسرے کو فداکاری اور جانبازی کا درس دیتے ہیں اور گویا عملاً یہ کہتے ہیں کہ مردِ خدا وہ ہے جو خدا کی راہ میں ہر چیز قربان کر دے جیسا کہ ان بزرگوار نے کیا۔ عید کے دن قربانی کے اسرار کا یہ ایک پہلو ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قربانی کے گوشت کے بارے میں اسلام کا کیا نظریہ ہے؟ کیا مسلمانوں پر اس سلسلے میں کوئی ذمے داری عائد ہوتی ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ سورۂ حج میں ان تمام لوگوں کو جو عیدِ قربان کے دن منیٰ میں قربانی کرتے ہیں یہ حکم دیتا ہے:

"وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ" (سورۂ حج آیت ۲۸)

قربانی کے گوشت میں سے فقراء کو کھلاؤ۔"

اور یہ بھی فرماتا ہے کہ:

"فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" (سورۂ حج آیت ۳۶)

قربانی کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور بیچاروں اور سوالیوں کو بھی کھلاؤ۔"

عملیہ رسالوں میں حکم دیا گیا ہے کہ خانۂ خدا کے زائر قربانی کے گوشت کے تین حصے کریں۔ ان میں سے ایک حصہ اپنے استعمال میں لائیں، ایک حصہ مومنین کو دے دیں اور

ایک حصہ محتاجوں میں تقسیم کردیں۔

ان واضح احکام سے ظاہر ہے کہ ان حیوانات کو ذبح کرنے کا مقصد مذکورہ بالا روحانی فوائد کے علاوہ یہ ہے کہ ان مذبوحہ حیوانات کو صحیح مصرف میں لایا جائے اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جو ان کے ضائع اور برباد ہونے کا موجب ہو۔

اب مسلمان حجاج اور اسلامی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ کوئی ایسا انتظام کریں کہ قربانی کا گوشت صحیح طور پر استعمال ہو اور یہ اسلامی فریضہ دوسرے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ موجودہ دور میں اس گوشت کو محفوظ کرنے کے لیے ضروری سازو سامان سے آراستہ سرد خانے تعمیر کرنے چاہئیں تاکہ اسے زمین میں دفن ہونے سے بچایا جاسکے اور بتدریج ان مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔

گزشتہ ادوار میں جب کہ حاجیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی قربانی کا گوشت صحیح طور پر استعمال ہو جاتا تھا لیکن موجودہ دور میں چونکہ سفر کی سہولتوں کے باعث حاجیوں کی تعداد بڑھ گئی ہے لہٰذا جدید وسائل کے ذریعے اس گوشت کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیے اور حاجیوں کی بہبود اور اسلامی مقاصد کو زیر نظر رکھنا چاہیے اور یہ اسلامی حکومتوں اور باشعور مسلمان قوموں کا فرض ہے کہ وہ اسلامی مقاصد کو عملی جامہ پہنائیں اور ہر قسم کے ضیاع اور اسراف کا سدِ باب کریں اور اگر اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ پیش آئے تو یہ خدا کے قانون کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا قصور ہوگا۔

نوٹ: بحمد اللہ کہ اب یہ قربانی کا گوشت اہل حاجت میں تقسیم کرنے کا طریقہ اپنا لیا گیا ہے۔ جیسا کہ آجکل یہ گوشت مکہ مکرمہ سے براہ راست افغان مہاجرین کے کیمپوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

(ناشر)

گمراہ کن کتابوں کا پڑھنا حرام کیوں ہے؟

سوال: جب اسلام علم ودانش کا مذہب ہے تو اس نے (گمراہ کن کتابوں) کا پڑھنا حرام کیوں قرار دیا ہے؟

جواب: بلاشبہ اسلام علم ودانش کا مذہب ہے اور یہ آسمانی مذہب لوگوں کو علم حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے اور عام کرنے کا شوق دلاتا ہے۔ یہ فرد اور معاشرے کا ارتقا اور ترقی علم ودانش کے حصول میں مضمر سمجھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام ایک بنیادی نقطے کی جانب پوری توجہ دیتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ جس طرح معاشرے کو مادی خطرات کے عوامل مثلاً وبائی امراض سے بچانا ضروری ہے اسی طرح ذہنی اور روحانی بے راہ روی کے عوامل سے بھی اس کی حفاظت کرنا لازمی ہے۔

آجکل کے تمدن میں لوگ آزاد ہیں کہ خواہ کوئی عقیدہ، نظریہ یا انحراف قبول کرلیں بشرطیکہ وہ معاشرے کے مادی نظام سے متصادم نہ ہو تاہم اسلام میں یہ صورت نہیں ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جو روحانی اور اخلاقی ارتقا کی راہ پر گامزن

ہو۔ تاہم یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ فکری اور اخلاقی بے راہ روی کے عوامل کے خلاف جنگ نہ کرے اور انہیں لوگوں کی زندگی پر مسلط ہونے سے روک نہ دے۔

اس بنیادی نکتے پر توجہ دینے سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے گمراہ کن کتابوں کو جو صحیح افکار و عقائد اور صحت مند اخلاق کو زک پہنچائیں کیوں ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر سب لوگوں کو اس قسم کی کتابوں اور تحریروں کے پڑھنے کی آزادی ہو تو لوگوں کے پاس اپنے افکار اور اخلاق کو بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا ضمانت باقی رہ جائے گی؟ پراپیگنڈے اور تبلیغ کی قوت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسی تحریریں تلقین اور تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو مکمل طور پر بھٹکا دیتی ہیں۔ ایسے بہت سے نوجوان ہیں جو گمراہ کن کتابوں اور عشق جنس اور جرائم پر مبنی ناولوں کے زیر اثر فساد اور اخلاقی انحطاط کے گڑھے میں جا گرے ہیں۔

انہیں مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر اسلام نے اس امر کی اجازت نہیں دی کہ معاشرے میں گمراہ کن کتابوں کی اشاعت آزادانہ طور پر ہو اور سبھی لوگ انہیں پڑھیں۔ تاہم اسی بنا پر کہ یہ مذہب علم و دانش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس نے ان کتابوں کا مطالعہ ان اہلِ علم کے لیے حرام قرار نہیں دیا جو حق اور باطل کو اپنی قوی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اہلِ علم نہ صرف یہ کہ ان کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں بلکہ مسلمان علما اور اہلِ دانش پر ان کا مطالعہ واجب اور لازم ہے تاکہ وہ مخالفین کی منطق کو سمجھ سکیں اور اس کا مقابلہ کر سکیں اور دشمنوں کے استدلال اور تبلیغ کے طور طریقوں سے واقفیت حاصل کر کے ان کا صحیح اور موثر توڑ دریافت کرنے کی کوشش کریں۔

تاریخ اسلام میں دینی پیشواؤں اور غیر اسلامی عقائد کے طرفداروں کے مابین بہت سے مذاکرات وقوع پذیر ہوئے ہیں اور احتجاج طبرسی[1] کے مؤلف جیسے کئی ایک مؤلفین نے اس قسم کے مباحثات کو جمع کر کے کتابی شکل دی ہے۔ یہ چیز خود اس

---

[1] احمد بن علی بن ابی طالب کی تحریر جو ۵۵۰ھ کے لگ بھگ فوت ہوئے۔ یہ کتاب کئی دفعہ چھپی ہے اور اہلِ بیتِ رسولؐ کے علوم کا ایک پہلو اجاگر کرتی ہے۔

بات کی مثال ہے کہ اسلام میں گمراہ کن کتابوں کا حرام قرار دیا جانا آزادیٔ فکر پر قدغن یا علم و دانش کی مخالفت کے معنوں میں نہیں ہے اور پیشوایانِ دین نے ہمیشہ اس قسم کے عقائد کا جواب فکر اور عقیدے کا گلا گھونٹنے کی شکل میں نہیں بلکہ منطق اور آزاد بحث کے ذریعے دیا ہے۔

قرآنِ مجید کسی غیر مسلم کو کیوں نہیں دیا جا سکتا؟

سوال: اگرچہ ہماری آسمانی کتاب یعنی قرآن مجید مختلف قوموں اور انسانی معاشروں کی ہادی اور رہنما ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ یہ دنیا کے تمام لوگوں کی دسترس میں ہو (قطع نظر اس سے کہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہوں) تاکہ اس کی تعلیمات سے بہرہ مند ہو سکیں اور حق و صداقت کے راستے پر گامزن ہوں لیکن اس کے باوجود ہم فقہی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ قرآنِ مجید کسی کافر کو بطور ہدیہ نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اس کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔

جواب: جب قرآن مجید کے غیر مسلم کے اختیار میں دینے کا مقصد اس کی ہدایت اور اسے اسلام کے بارے میں واقفیت بہم پہنچانا اور اس کا گرویدہ کرنا ہو اور یہ مقصد اس کے ترجموں سے حاصل نہ ہو سکتا ہو تو اس صورت میں قرآنِ مجید کو کافر کے اختیار میں دینے کی کوئی ممانعت نہیں لیکن اگر کوئی مقصد مدِّ نظر نہ ہو تو پھر ممنوع ہے کیونکہ:

حقانیت اسلام کا سب سے بڑا شاہد اور پیغمبر اسلامؐ کا جاودانی معجزہ قرآن مجید ہے جو ایک زندہ دستاویز کی شکل میں زمانوں کی چوٹی پر چمک رہا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے اچھی شکل میں چھاپ کر ساری دنیا میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ حقیقت کے متلاشی افراد اس کی آیات کی روشنی میں دین اسلام سے واقفیت پیدا کر لیں۔ یہ چیز بجائے خود اس کتاب کے مندرجات کی قطعیت پر گواہ ہے کہ یہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور ہر دور میں بنی نوع انسان کو اپنے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔

قرآن مجید رسولِ اکرمؐ کو حکم دیتا ہے کہ اگر اثنائے جنگ میں بھی ایک غیر مسلم خدا کا کلام (قرآن مجید) سننے پر مائل ہو تو آپ کو چاہیے کہ اسے اجازت دیں کہ مسلمانوں کے درمیان آئے اور ارشاد خداوندی سنے اور اگر وہ واپس جانے پر مائل ہو تو اسے اس کے پہلے مقام پر پہنچا دیں۔ [1]

تاہم ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ قرآن مجید کے احترام کی حفاظت کرے اور جب کبھی اس بات کا احتمال ہو کہ ممکن ہے ایک غیر مسلم قرآن مجید کے بارے میں کوئی ایسی حرکت کرے جو ہتک اور جسارت شمار ہو تو اس صورت میں ہمیں کتابِ خدا اس کے سپرد نہیں کرنی چاہیے اور اگر پہلے سے اس کے پاس موجود ہو تو جس طرح ممکن ہو اس سے واپس لے لینی چاہیے۔ جب فقہائے اسلام فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید کافر کے سپرد نہیں کیا جا سکتا تو بظاہر ان کی رائے اسی صورت سے ہے اور اس صورت سے نہیں جب کافر کی ہدایت مقصود ہو۔

المختصر قرآن مجید کو آلودہ ہاتھوں کی دسترس سے دور رہنا چاہیے بجز اس کے کہ اس کی بدولت ان کی رہنمائی کا احتمال ہو کیونکہ اس صورت میں یہ ان کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] سورۂ توبہ۔ آیت ۶

بعض جرائم کے ثابت کرنے میں سخت گیری کی وجہ

سوال: عفت کے منافی عمل کے ارتکاب کے ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی کیوں ضرورت ہے ؟ کیا اثبات جرم کی کارروائی میں یہ سخت گیری منافی عفت عمل کی کثرت کا موجب نہیں ہے ؟
علاوہ ازیں اس کی کیا وجہ ہے کہ:

"اِقْرَارُ الْعُقَلَاءِ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ جَائِزٌ"۔

یعنی جب کوئی عاقل شخص ایسا اقرار کرے جو خود اس کے لیے مضر ہو تو وہ اقرار مؤثر ہوگا کا قاعدہ یہاں کالعدم قرار دیا گیا ہے اور اگر کوئی شخص خود منافی عفت عمل کے مرتکب ہونے کا اعتراف کرے تو تین مرتبہ اس کا اعتراف قبول نہیں ہوتا اور فقط چوتھی دفعہ قبول کیا جاتا ہے ؟

جواب: اصولاً منافی عفت اعمال کی سزا کے سلسلے میں اسلامی قانون کی ایک خاص صورت ہے جس میں کئی لازمی پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے۔

ایک طرف تو ان اعمال کے لیے بے حد شدید اور سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں جو کوڑوں اور جلاوطنی سے شروع ہوتی ہیں اور بعض اوقات موت کی سزا پر ختم ہوتی ہیں۔

لیکن دوسری طرف اس جرم کے ثابت کرنے کا طریقہ مشکل قرار دیا ہے چنانچہ اسے ثابت کرنے کے لیے ضروری گواہوں کی تعداد دوسرے جرائم کے مقابلے میں دگنی رکھی گئی ہے اور کسی شخص کا اس کے ارتکاب کا ایک دفعہ اقرار کرنا بھی کافی نہیں سمجھا جاتا۔

ان دو پہلوؤں کا باہم پیوست ہو جانا یعنی سزا کا سخت ہونا اور جرم کے ثابت کرنے کے معاملے میں سخت گیری اس تعزیری قانون کو ایک مخصوص شکل دے دیتا ہے اور وہ اس معنی میں کہ یہ قانون لوگوں کی جانب سے اس قسم کے گناہوں کے ارتکاب کی روک تھام کے لیے نفسیاتی تاثیر تو رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود عملاً زیادہ لوگوں کو اس سزا میں شامل نہیں کرتا۔

دوسرے الفاظ میں اس قسم کے قوانین کا اصلی مقصد لوگوں کو ارتکاب جرم سے روکنا ہے لیکن انہیں سزائے موت دینا یا ختم کر دینا نہیں ہے۔ یہ اثر سزا کے سنگین ہونے سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ جو شخص اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے وہ ہر لحظہ سخت سزا کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ کچھ ناگہانی حالات کے نتیجے میں اس کا جرم ثابت ہو جائے گا۔ اس بنا پر وہ خوف اور وحشت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور آئندہ کی ممکنہ سزا سے یہی خوف اور وحشت اکثر لوگوں کو گناہ کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک بڑے جرم (مثلاً مسکر مواد کا بیچنا) کے ارتکاب کے لیے خاص حالات میں سزائے موت جیسی سخت سزائیں مقرر کی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ سزائیں خاص حالات سے مخصوص ہیں لیکن ان خاص حالات کے وجود میں آنے کا احتمال ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے ذہن پر معتدبہ اثر ڈالتا ہے۔

خلاصہ اس بات کا یہ ہے کہ اسلام کے اس قسم کے تعزیری احکام اس انداز سے

معین کیے گئے ہیں کہ وہ گناہ کی روک تھام کے لیے بے حد مؤثر ہیں اور اس کے ساتھ بہت زیادہ لوگوں کو اپنی لپیٹ میں بھی نہیں لیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ موت کی سزا خواہ ایک یا چند اشخاص کو ہی دی جائے دوسرے مرتکبین کے خیالات پر اس کا شدید اثر پڑتا ہے کیونکہ ان کی بیداری کے لیے یہی کافی ہے کہ ایک دن ان کے قانون کے چنگل میں پھنسنے کا احتمال ہے۔

حیوان کو مخصوص شرائط کے تحت کیوں ذبح کرنا چاہیے ؟

سوال: اسلام میں حیوانات کے ذبح کرنے کے لیے کچھ شرائط مقرر کی گئی ہیں مثلاً گردن کی چاروں رگیں کاٹنا اور بسم اللہ پڑھنا وغیرہ اگر یہ شرائط پوری نہ کی جائیں تو حیوان کا گوشت استعمال کے قابل نہیں ہوتا حالانکہ دنیا کے بہت سے لوگ ان احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے حیوان کا گوشت استعمال کرتے ہیں اور ان پر اس کا کوئی خراب اثر مرتب نہیں ہوتا۔ توضیح فرمائیں کہ ان شرائط کا کیا مقصد ہے ؟

جواب: یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ان احکام سے تین مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے:

پہلا مقصد بت پرستوں کے دستور سے دوری اختیار کرنا ہے جو اپنے جانوروں کی گردن 'بت' کا نام لے کر کاٹتے ہیں لہٰذا اللہ کا نام لینا اس وسیع لائحہ کار کے ایک حصے کے طور پر لازم سمجھا گیا ہے جس کی بنیاد اسلام نے بت پرستی کے افکار کو ملیامیٹ کرنے کے لیے رکھی ہے۔

دوسرا مقصد حیوان کے بدن سے خون کو باہر نکالنا ہے تاکہ وہ گوشت کی تہوں میں نہ

رہ جائے اور اس کے ساتھ کھایا نہ جائے۔ دورِ حاضر کی طب نے خون پر مشتمل غذا کے بہت سے نقصانات کا انکشاف کیا ہے۔ اس کے علاوہ خون ہمیشہ مختلف قسم کے جراثیم سے پُر رہتا ہے۔ تجربے سے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ خون پر مشتمل غذا انسان میں ناپسندیدہ ذہنیت اور خصلتیں پیدا کرتی ہے جن میں احساسات کی کمزوری، سفاکی اور قساوتِ قلبی شامل ہیں۔

تیسرا مقصد یہ ہے کہ حیوان کی جان جتنی جلد ہو سکے نکل جائے اور اسے اذیت اور کرب میں مبتلا نہ رکھا جائے کیونکہ ایسا کرنا انسانیت کی روح کے منافی ہے۔ یہ مقصد گردن کی چاروں رگیں کاٹنے سے جلدی حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ ان تین مقاصد کا خلاصہ ہے جو ذبح کے بارے میں اسلامی شرائط پر عمل پیدا ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔

ختنہ

سوال: حفظانِ صحت کی رو سے ختنہ کا فلسفہ کیا ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ:

(۱) جن لوگوں کے ختنے نہ ہوئے ہوں ان میں سے کئی ایک کی جھلی اور آلۂ تناسل کے سرے کے درمیان عفونت کی تشکیل زیادہ پائی جاتی ہے اور ختنے کا عمل اس تکلیف کا سدِ باب کرتا ہے۔

(۲) اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ جن لوگوں کے ختنے نہ ہوئے ہوں ان میں آلۂ تناسل کے سرطان کی بیماری زیادہ ہوتی ہے البتہ یہ بات مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ جن شیر خوار بچوں کے ختنے جلدی کر دیے جاتے ہیں ان کے آلۂ تناسل کے سرے پر زخم ہو جانے کے بعد حفظانِ صحت کے اصولوں کی عدم رعایت کی وجہ سے پیشاب کی نالی کے انتہائی باہر والے حصے کا سوراخ تنگ ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے لیکن ان بچوں کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ وہ اس مذہبی وظیفے کے فوائد سے بہرہ ور

ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح طور پر انجام نہ دینے سے پیدا ہونے والے ممکنہ نقصان سے محفوظ رہیں۔

حلالہ کا فلسفہ

سوال: جس مرد نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں اگر وہ دوبارہ اس سے شادی کرنا چاہے تو یہ کیوں ضروری ہے کہ عورت پہلے کسی دوسرے مرد سے شادی کرے؟

جواب: قرآن مجید کی پیروی کرتے ہوئے علمائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ اگر ایک مرد اپنی بیوی کو مخصوص شرائط کے ساتھ تین مرتبہ طلاق دے دے تو وہ شخص اس عورت سے اس وقت دوبارہ شادی کر سکتا ہے جب وہ عورت پہلے کسی دوسرے مرد سے شادی کرے۔ اگر وہ مرد اسے طبیب خاطر طلاق دے دے تو پھر وہ عورت اور پہلا شوہر چوتھی دفعہ شادی کر سکتے ہیں اور جب تک یہ کام انجام نہ پائے وہ عورت پہلے شوہر پر حرام ہے۔

اس شرط کا فلسفہ ظاہر ہے اور اسے عائد کر کے اسلام چاہتا ہے کہ طلاقوں کی کثرت میں کمی پیدا کرے اور اس بات کا سدباب کرے کہ طرفین طلاق کو ایک کھیل

نہ بنالیں اور جب جی چاہے شادی رچالیں اور جب جی چاہے ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں کیونکہ:

۱- جب ایک مرد تیسری طلاق کا اقدام کرنا چاہے اگر وہ "محلّل" کے موضوع کی جانب متوجہ ہو اور یہ جانتا ہو کہ یہ چوتھا ازدواج اس بات پر منحصر ہے کہ یہ عورت کسی اور شخص سے شادی کرے اور پھر طلاق لے تو ممکن ہے کہ وہ سرے سے طلاق دینے کا ارادہ ہی ترک کر دے کیونکہ عورت اور مرد کا طلاق کا اقدام کرنا عموماً مصالحت کی امید سے وابستہ ہوتا ہے اور یہ امید تیسری طلاق میں بالکل معدوم ہو جاتی ہے کیونکہ دوسرے شخص کو کوئی بھی طلاق دینے پر مجبور نہیں کر سکتا اور ممکن ہے کہ طرفین کے مزاج ایک دوسرے سے ایسی موافقت پیدا کر لیں کہ وہ ازدواج جاری رکھنے پر مائل ہوں یا کم از کم دوسرا شوہر (محلّل) طلاق دینے پر تیار نہ ہو۔ اس بات کا خوف کہ شاید دوسرا شخص عورت کو طلاق نہ دے بہت سے لوگوں کے لیے مؤثر ثابت ہوتا ہے اور انہیں طلاق کے اقدام سے باز رکھتا ہے۔

۲- چوتھے ازدواج میں "محلّل" کے وجود کا لازمی ہونا مرد کے حسد یا زیادہ صحیح الفاظ میں جذبات، غیرت اور جرأت کو حرکت میں لاتا ہے تاکہ وہ طلاق کا خیال اپنے دماغ سے نکال دے کیونکہ غیرت اور مخصوص ازدواجی جذبہ اس امر سے مانع ہوتے ہیں کہ ایک عورت جس نے ایک عرصے تک اس کے ساتھ زندگی بسر کی ہو طلاق کے بعد مشروع طریقے سے بھی دوسروں کے اختیار میں چلی جائے اور اسلام نے دوبارہ شادی کے لیے "محلّل" کا مسئلہ پیش کر کے مردوں کے جذبات کو عورتوں کے فائدے اور ازدواجی رشتے کی بقا کے لیے ابھارنا چاہا ہے اور اس صحیح اور معقول طریقے سے طلاقوں کی کثرت کی روک تھام کی ہے۔

آخر میں اس نکتے کا ذکر بھی کرنا چاہیے کہ دوسرے شخص کے ساتھ شادی بعض

اوقات عورت کے پہلے شوہر کی جانب میلان میں شدت پیدا کرتی ہے کیونکہ بعض اوقات دوسری شادی عورت کی خواہشات سے ہم آہنگ نہیں ہوتی اور وہ آرام اور آسائش جو اسے پہلے شوہر کے گھر میں نصیب تھی دوسرے شوہر کے گھر میں میسّر نہیں آتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہلے شوہر کا محبت آمیز سلوک اور اخلاق اسے بہتر معلوم ہونے لگتا ہے ان حالات کے پیش نظر اور دونوں شوہروں کے مابین موازنہ کرنے سے اس کے اندر ایک روحانی انقلاب آجاتا ہے اور وہ اپنی سابقہ زندگی کی قدر و قیمت پہچاننے لگتی ہے چنانچہ وہ حسرت اور ندامت کے ساتھ دلی فیصلہ کرتی ہے کہ اگر حالات پلٹا کھا جائیں اور وہ ایک دفعہ پھر سابقہ شوہر سے شادی کر سکے تو جہاں تک ممکن ہو سکا زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرے گی اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دینے سے گریز کرے گی اور صبر واستقامت کی بدولت اپنی غیر ہم آہنگی کا خاتمہ کر دے گی۔

جنسی بے راہ روی کے جسمانی اور نفسیاتی خطرات

(ان معاملات سے واقف ایک نفسیاتی معالج کا نظریہ)

سوال: کیا استمناء (مشت زنی) کا عمل نقصان دہ ہے ؟

جواب: اگرچہ بعض بے خبر طبیب اور غیر محقق ماہر نفسیات اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ استمناء کے مکروہ اور مذموم عمل کو کچھ نوجوانوں کے سامنے ایک بے ضرر چیز کے طور پر پیش کریں لیکن کثیر تعداد میں وہ خطوط جو ہمیں مریضوں کی جانب سے موصول ہوئے ہیں اور حسی اور خارجی مشاہدات مکمل گواہی دیتے ہیں کہ یہ کہنا درحقیقت ایک قسم کا حسی حقائق سے انکار اور نوجوانوں کو یقینی طور پر دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔

اب ہم ایک مدلل اور محققانہ مقالے کا اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جسے ایک مشہور ماہر نفسیات (ڈاکٹر جہرازی) کے مقالے سے اخذ کیا گیا ہے اور جو اس سوال کا واضح جواب ہے۔

نوجوان کئی ایک پیچیدہ مسائل سے دوچار ہیں جن میں سے ایک جنس کا معاملہ ہے۔ درحقیقت عمر کے اس مرحلے پر جنسی خواہشات ایک شکل اختیار کر لیتی ہیں اور

کچھ چھان بین کے بعد نوجوان اس جبلت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی جنسی ترغیب اور تحریک نوجوان کی طبیعت میں شہوت کی آگ بھڑکاتی ہے۔

گذشتہ زمانے میں مذہبی تربیت اور معاشرتی رسوم اور آداب کے زیر اثر نوجوان اس اصول کے پابند تھے کہ جنسی خواہشات سے دوچار ہونے پر انہیں دبا لیتے تھے اور اپنے آپ پر قابو پا کر جنسی تحریک کے نزدیک بہت کم پھٹکتے تھے۔

لیکن موجودہ زمانے میں گلی کوچوں، سڑکوں اور گھروں میں نظر آنے والے جنسی مناظر اور پراپیگنڈے پر مبنی اشتہارات اور عریاں تصاویر کا مشاہدہ اور رسالے، روزنامے، سینما اور ٹیلیویژن کی فلمیں اور تفریحی داستانیں سب مل کر اس حس کو ابھارنے میں بڑا مؤثر کردار ادا کرتی ہیں جس کے نتیجے کے طور پر جدید زندگی میں نوجوان شدید اور پرشور جنسی خواہشات سے دوچار ہیں۔

یہی وہ مرحلہ ہے جب نوجوان اپنے ہم عمروں کے وسیلے سے سیکھ کر یا نیند وغیرہ میں انزال سے دوچار ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ اس سے لذت حاصل کرتا ہے اس لیے اس لذت کے عوامل کو دہراتا ہے اور اس کا یہ فعل رفتہ رفتہ استمناء پر منتج ہوتا ہے اور اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی مشکل پیدا کر دیتا ہے۔

کچھ اطباء اور ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ استمناء ایک طبیعی امر ہے۔ وہ انسانوں اور حیوانوں کے لیے اس کی ضرورت کو ایک فطری چیز تصور کرتے ہیں لیکن وہ اس بات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے کہ اگر اس کام کی تکرار کی جائے اور نوبت ہفتے میں کئی بار تک پہنچ جائے تو نوجوان کو جسمانی اور نفسیاتی نشو و نما کے لحاظ سے کس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے اور بدقسمتی سے عموماً یہ عادت بتدریج شدت اختیار کر جاتی ہے اور چونکہ اس کے وسائل آسانی سے نوجوان کی دسترس میں ہوتے ہیں اس لیے وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اس فعل کے متعدد بار کرنے سے اس کی انجام دہی میں فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔

اس عادت کے منحوس نتائج

اس تحقیق سے جو پچھلے چند سالوں میں کی گئی ہے اور بالخصوص اس تحقیق اور مطالعے سے جو ہم نے دو ہزار سے زائد نوجوانوں کے بارے میں کیا ہے یہ بات مسلمہ طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ استمناء کے موضوع کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس قول کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے جنسی غدود کی عضویات (PHYSIOLOGY) کا ذکر کریں:

بلوغت کی ایک نشانی فوطوں کے غدود کے خلیوں میں سے منی کا خارج ہونا ہے۔ منی کے ہر قطرے میں لاکھوں کروڑوں نر انڈے اور ایک مخصوص لیس دار سیال مادہ ہوتا ہے جو فوطوں کی غدودوں سے خارج ہوتا ہے اور منی کی نالی کے ذریعے منی کی تھیلی میں پہنچتا ہے جو مثانے کی تھیلی کے پیچھے ہوتی ہے۔

منی کی تھیلی بتدریج پُر ہو جاتی ہے اور منی کا کچھ حصہ بدن میں جذب ہو جاتا ہے اور نوجوانوں کے اعضاء کی نشو ونما میں مدد دیتا ہے اور جنسی میلانات کا محرک بنتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کی زیادہ مقدار خارج ہو جائے اور اولاد پیدا کرنے کے کام آئے۔

جو نوجوان جنسی تحریکات کی جانب کم مائل ہوتے ہوں اور مذہبی اعتقادات اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل درآمد انہیں غلط تحریکات سے باز رکھتا ہو ان کی منی کی تھیلی پُر ہو جانے پر منی عموماً نیند کی حالت میں احتلام کی شکل میں خارج ہو جاتی ہے اور حیاتیاتی (BIOLOGICAL) توازن برقرار ہو جاتا ہے لہٰذا ان کے بارے میں فکر مند ہونے کی کوئی بات نہیں۔

لیکن جن جوانوں کی جنسی تحریک کے عوامل بہت زیادہ ہوں اور محرومی کی حالت میں دن کاٹ رہے ہوں وہ استمناء کو فراغتِ خاطر کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں اور چونکہ ایک ایسا شخص ہر جنسی تحریک کے بعد اپنا سکون استمناء میں تلاش کرتا ہے اس لیے وہ اس عمل کو بار بار دہراتا ہے اور جب یہ عمل بار بار دہرایا جائے اور نوبت ہفتے میں چند بار

تک پہنچ جائے تو نوجوانوں کی نفسیاتی اور جنسی کیفیت فطری حالت سے مختلف ہو جاتی ہے اور اس کے مدارِ جنسی کا نظام بگڑ جاتا ہے جس کی سب سے بڑی علامت جنسی کمزوری ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ:

جب جنسی تحریک کی تکمیل فطری طریقے سے اور ازدواج کی شکل میں ہو تو مشاہدے، لمس اور دوسرے حواس کے ذریعے نوجوان کے مغز میں اس کی جنسی تحریکات کا مرکز برانگیختہ ہو جاتا ہے اور جسم انسانی کی ساخت کی بنا پر جو تاثر آنکھ اور لمس وغیرہ سے مغز کے مراکز میں منتقل ہوتی ہے وہ جنسی عمل پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں جنسی عمل فطری شکل میں انجام پذیر ہوتا ہے۔

لیکن استمناء کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اور یہ ایک دوسرا طریقہ ہے جس میں تخیّل اور خاص مناظر کا تصوّر اور ایک مقام کو چھونا فطری تحریک کے عوامل کی جگہ لے لیتے ہیں اور یوں مدارِ جنسی میں ایک غلط ردِّ عمل کا نظام پیدا ہو جاتا ہے۔

جب یہ عمل بار بار دہرایا جائے اور غلط ردّ عمل نوجوان کے وجود میں مستحکم ہو جائے تو یہ امر اس کا موجب بنتا ہے کہ جب وہ جنسی عمل فطری طور پر انجام دینا چاہے تو ناکام رہتا ہے کیونکہ اس کے اندر جنسی تحریک کی تکمیل کا فطری نظام بگڑ چکا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ ازدواج کے وقت اپنے آپ کو کامیابی کے قابل نہیں پاتا۔

یہ کیفیت اسے بے حد متوحش اور پریشان کر دیتی ہے اور اس عمل کی تکرار اسے عارضی طور پر ذہنی پریشانی سے باہر نکال لاتی ہے تاہم اس کا جاری رکھنا اس کی شخصیّت اور نفسیات پر اثر انداز ہوتا ہے۔

بلاشبہ اس حالت میں نوجوان کی وحشت، پریشانی اور الجھن بجائے خود اس فعل میں شدت کی وجہ بن جاتی ہے حالانکہ اگر وہ اپنی مذموم عادت بالکل ترک کر دے اور اپنے سکونِ قلب کی حفاظت کرے اور اس عادت کی بجائے کوئی اچھی عادت اپنا لے تو وہ یقینی طور پر صحت یاب ہونے کے قابل ہو جائے گا۔

استمناء میں مبتلا لوگوں کی جسمانی خرابیاں

ایک اور اہم نکتہ جو یہاں قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں منی کا کچھ حصّہ بدن میں جذب ہو جاتا ہے اور نوجوان کی نشو و نما کا موجب بنتا ہے وہ نہ صرف اس کی جسمانی نشو و نما میں مؤثر ہے بلکہ اس کی ترقی پر بھی بے حد اثر ڈالتا ہے۔

جب یہ مواد بار بار استمناء کرنے کے نتیجے میں خارج ہوتا ہے تو کامل جنسی پختگی کی تشکیل میں خلل ڈالنے کے علاوہ لاغری، شخصیت کی کمزوری، ارادے کی کمزوری، طاقت کی کمی، بے حد ترشیلے پن اور نفسیاتی قوت کی کمی کا سبب بنتا ہے۔

بہتر ہوگا کہ ہم ان دو موضوعات کی وضاحت کے لیے استمناء میں مبتلا چند ایسے لوگوں کے بیانات پر نظر ڈالیں جو ازدواج کے بعد ناکام ہو گئے ہیں یا اپنی بیوی سے ہم بستر ہو کر لذت حاصل نہیں کر پاتے یا سرد مزاجی اور جنسی کمزوری کا شکار ہیں۔

ایک شادی شدہ جوان کا کہنا ہے:

"میں اپنی بیوی کو پرستش کی حد تک چاہتا ہوں لیکن اس سے ہم بستری کر کے لذت حاصل نہیں کر پاتا اور یہ چیز مجھے دکھ دیتی ہے۔"

ایک خاتون نے کہا:

"میری شادی کو تین مہینے ہو چکے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے شوہر کی نظر میں ایک خشک لکڑی کے ٹکڑے کی مانند کیوں ہوں۔"

ایک نوجوان مرد نے بتایا کہ میں بالغ ہونے کے وقت سے بار بار یہ مذموم عمل انجام دیا کرتا تھا۔ بعد میں اپنی بیوی سے ہم بستری میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو محض سوچنے سے تحریک ہو جاتی ہے۔

جب دو اور نوجوانوں سے رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ عمل بار بار کرنے کی وجہ سے ہم اپنی بیویوں سے ہم بستری کے قابل نہیں اور اس بنا پر ہم سخت

شرمندہ ہیں۔

ایک اور جوان نے کہا:

"مجھے اپنی بیوی سے عقد کیے چھ مہینے ہو گئے ہیں لیکن بد قسمتی سے اس عادت میں مبتلا ہونے کی بنا پر میں فریضۂ ازدواج ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ گوشہ نشین اور تنہائی پسند نوجوانوں کے اس عادت میں مبتلا ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ نوجوان بلاوجہ گوشہ نشینی سے پرہیز کریں اور اپنے لیے اچھے اور باایمان دوستوں کا انتخاب کر کے اس خطرے کا سدِّ باب کر دیں۔

شخصیت کی کمزوری اور وسواس

ایک اور نقصان جو نوجوانوں کو اس عادت سے پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر یہ کام کرنے کے بعد نادم اور پشیمان ہوتے ہیں اور اپنے دل میں عہد کرتے ہیں کہ آئندہ یہ کام نہیں کریں گے لیکن بد قسمتی سے اس کام کے اسباب مہیا ہو جانے پر اسے پھر کرنے لگتے ہیں۔

یہ بار بار کی "ندامت" اور بار بار کا "اقدام" ان کی روح کو بے حد دکھ دیتا ہے اور اس امر کا سبب بنتا ہے کہ نوجوان شخصیت اور ارادے کی کمزوری اور شک اور وہم وغیرہ سے دوچار ہو جائیں۔

مختصر یہ کہ استمناء کا عمل جنسی مسائل میں نفسیاتی ردِّ عمل کے نظام کو غلط راستے پر ڈال کر لذّت اور توانائی کے احساس میں خلل پیدا کر دیتا ہے اور اس کا نتیجہ شرمندگی، احساسِ کمتری اور شخصیت کی پراگندگی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے علاوہ ازیں اس کی زد جوانوں کی نشوونما پر بھی پڑتی ہے۔ (ڈاکٹر جھرازی کے مقالے سے اقتباس)

ضروری یاددہانی

ان خطرات کے رونما ہونے کا سدّباب کرنے کے لیے نوجوانوں کو چاہیے کہ نہ صرف یہ کہ بلاوجہ خوف، وحشت اور پریشانی کا شکار نہ ہوں بلکہ اس منحوس عادت کا پوری شدّت، ہمت اور مکمّل اعتماد کے ساتھ مقابلہ کریں۔

سب سے پہلے انہیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مصنوعی تحریک کے وسائل مثلاً عریاں تصاویر، فحش لٹریچر اور گمراکن فلموں کو اپنی دسترس سے یکسر خارج کردیں اور مصمّم ارادہ کرلیں کہ آئندہ ان کے قریب نہیں پھٹکیں گے۔

بعدازاں اچھے دوستوں کے انتخاب، گوشہ نشینی حتیٰ کہ کمرے میں تنہا سونے سے پرہیز، مفید ورزشوں کے انتخاب اور صحت مندانہ سرگرمیوں سے اپنے فراغت کے اوقات کو یوں پُر کریں کہ کسی وقت بھی بیکار نہ رہیں۔

بے راہ رو افراد سے میل جول رکھنے سے پوری سختی سے پرہیز کریں اور کئی ایک اچھی عادتیں اپنا کر اس عادت سے چھٹکارا حاصل کریں۔

نوجوانوں کو چاہیے کہ نیم حکیموں اور نادان نفسیاتی ڈاکٹروں کی زہریلی تحریروں کے فریب میں ہرگز نہ آئیں جو اس مذموم فعل کے بارے میں اطمینان دلاتے رہتے ہیں۔

دو خونی رشتہ داروں کا آپس میں شادی کرنا کیسا ہے؟

سوال: وہ کون سے حالات ہیں جن میں دو خونی رشتہ داروں کے آپس میں شادی کرنے سے صحت کے لیے کسی ضرر کا احتمال نہیں ہوتا؟

جواب:[1] تقریباً ایک صدی پیشتر "مندل" نے آٹھ سال کی تحقیق کے بعد مسئلہ توارث کا ایک اصول دریافت کیا جسے ہم ذیل میں قارئین کی دلچسپی کے لیے سادہ زبان میں بیان کرتے ہیں:

اگر دو ایسے چوہوں کا انتخاب کیا جائے جن میں سے ایک کا رنگ سفید اور دوسرے کا خاکستری ہو،ان کا جوڑا ملایا جائے تو ان کے بچے بلا استثنا خاکستری رنگ کے ہوں گے اور اگر اس گروہ کا ایک دوسرے سے جوڑا ملایا جائے تو کچھ چوہے خاکستری رنگ کے ہوں گے اور کچھ سفید پیدا ہوں گے۔ سفید اور خاکستری رنگ کو اصطلاحاً ایک صفت کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا پہلی نسل کے تمام چوہے خاکستری رنگ کے ہوں گے یعنی ان دو صفتوں

---

[1] یہ جواب ڈاکٹر فریدون زرگنہ نے دیا ہے۔

یں سے جو والدین میں موجود ہیں ایک مکمل طور پر ظاہر ہوگی اور دوسری مخفی رہے گی اصطلاحاً جو صفت ظاہر ہو جائے (خاکستری رنگ) اسے "بارز" یا غالب اور جو صفت مخفی رہے (سفید رنگ) اسے "نہفتہ" متغلوب کہا جاتا ہے۔

مذکورہ مثال میں صفت (خاکستری یا سفید رنگ) پیدا کرنے والا عامل Genes کہلاتا ہے جو تناسلی خلیوں کے ذریعے والدین سے اولاد کو منتقل ہوتا ہے۔

جب ایک حیوان کو وجود میں لانے والے تناسلی خلیے اس صفت کو پیدا کرنے والے Genes کی حیثیت سے یکساں ہوں تو حیوان کو خالص صفت کی بنا پر ہوموزیگوٹ کہا جاتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ایسا موجود بذاتِ خود یہ صفت پیدا کرنے کے لیے ویسے ہی تناسلی خلیے وجود میں لائے گا اور دو خالص افراد کا جوڑا ملانے کا نتیجہ ہمیشہ ایسے بچوں کی پیدائش کی صورت میں نکلے گا کہ زیرِ غور صفت کے لحاظ سے وہ مکمل طور پر اپنے والدین سے مشابہ ہوں گے۔

جب ایک حیوان کو وجود میں لانے والے تناسلی خلیے اس صفت کے پیدا کرنے کرنے والے Genes کی حیثیت سے یکساں نہ ہوں تو اس حیوان کو ناخالص صفت کے لحاظ سے ہٹروزیگوٹ کہتے ہیں۔ مذکورہ بالا مثال میں خاکستری رنگ کے چوہے جو پہلی نسل میں پیدا ہوئے ناخالص موجودات ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک پیدا کرنے والا ایک Genes خاکستری رنگ کا اور ایک Genes سفید رنگ کا رکھتا ہے اس میں شک نہیں کہ ان افراد کے تناسلی خلیے بھی ایک جیسے نہیں تھے بلکہ ان میں سے ۵۰ فیصد خاکستری رنگ پیدا کرنے والے اور ۵۰ فیصد سفید رنگ پیدا کرنے والے Genes رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دو ناخالص افراد کا جوڑا ملانے کے نتیجے میں ہمیشہ ایسے فرزند نہیں پیدا ہوتے جو زیرِ غور صفت کے لحاظ سے اپنے والدین سے مشابہ ہوں۔ مذکورہ بالا مثال میں دوسری نسل کے چوہوں میں سے بعض سفید اور بعض خاکستری رنگ کے ہیں۔

اس تمہید کے ساتھ جو قارئینِ عزیز کو علمِ وراثت کی مبادیات سے آشنا کرنے کے لیے سپردِ قلم کی گئی ہے۔ اب ہم مجملاً اصل موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی طبی نقطۂ نگاہ سے

دو خونی رشتہ داروں کی باہمی شادی کی کیا کیفیت ہے۔

اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جب کسی خاندان میں کوئی موروثی بیماری موجود ہو تو اس خاندان سے تعلق رکھنے والے دو خونی رشتہ داروں کا آپس میں شادی کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ ایسی شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد میں موروثی بیماری کے ظاہر ہونے کا احتمال ایسے میاں بیوی کی اولاد کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے جن میں خونی رشتہ داری نہ ہو (اس بارے میں ذیل میں وضاحت کی جائے گی)۔

اگر دو ایسے افراد جو ایک غالب موروثی بیماری میں مبتلا ہوں آپس میں شادی کریں تو ان کے تمام فرزند غیر فطری Genes کے مالک یا دوسرے لفظوں میں ہموزیگوٹ ہوں گے۔ مبتلا بچوں کی بیماری عموماً والدین میں سے ہر ایک کے مقابلے میں زیادہ شدید ہو گی اور بیماری کی شدت اس قدر بھی ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے بعض صورتوں میں ہموزیگوٹ" ولادت سے پہلے یا اس کے تھوڑی مدت بعد موت سے ہمکنار ہو جائیں۔

اب اگر والدین میں سے کسی ایک میں یہ غالب موروثی بیماری پیدا کرنے والے Genes موجود نہ ہوں تو تمام فرزند اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوں گے اور جو مبتلا ہوں گے ان کی بیماری ماں باپ سے زیادہ شدید نہیں ہو گی۔

مغلوب موروثی بیماری کی صورت میں اگر ماں یا باپ ہیٹروزیگوٹ ہوں تو ایک چوتھائی بچے بیماری میں مبتلا ہوں گے جب کہ اگر والدین سے ایک بیماری کے Genes نہ رکھتا ہو تو کوئی بچہ بیماری میں مبتلا نہیں ہو گا البتہ دوسری شق میں گو آدھے بچے ہیٹرو زیگوٹ ہوں گے لیکن چونکہ موروثی بیماری مغلوب ہے اس لیے ہیٹروزیگوٹز میں ظاہر نہیں ہو سکتی۔

مندرجہ بالا حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مشورہ دیا جاتا ہے کہ لوگ اپنے خونی رشتہ داروں سے شادی رچانے سے حتی الامکان پرہیز کریں۔

تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر میاں بیوی کسی موروثی بیماری میں مبتلا نہ ہوں

توپھر اس شادی میں قطعاً کوئی خطرہ نہیں لہٰذا بعض لوگوں کا یہ گمان کرنا کہ خاندان میں شادی کرنا ہمیشہ مضر ہوتا ہے بالکل بے بنیاد ہے بلکہ ایسی شادی صرف اس وقت مضر ہے جب ایک موروثی بیماری موجود ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشکوک صورتوں میں احتیاط رکھتے ہوئے ایسی شادی سے اجتناب برتنا بہتر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کچھ اسلامی روایات میں استثنائی صورتوں کے علاوہ چچا کے بیٹے اور چچا کی بیٹی کی باہمی شادی سے منع کیا گیا ہے اور اسے ترک کرنا بہتر گردانا گیا ہے۔

موسیقی اسلام کے نقطہ نظر سے

سوال: اسلام نے موسیقی کو کیوں حرام قرار دیا ہے اور اس کی حرمت کا کیا فلسفہ ہے؟

جواب: اگرچہ موسیقی کی مختلف اقسام کا غیر معمولی رواج اکثر افراد کے اس کے متعلق صحیح اور معقول انداز میں سوچنے سے مانع ہے اور بہت سے لوگ اس غلط طرزِ فکر کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے جس کے مطابق ہر چیز کا عام ہونا اسکے بے عیب ہونے کی دلیل سمجھا جاتا ہے موسیقی کے منحوس اور مضر اثرات کا مطالعہ کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ تاہم حقیقت پسند افراد اس صورتِ حال پر بھی قناعت نہیں کرتے اور ان چیزوں کے رائج ہونے کے باوجود ہمیشہ حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور تحقیق میں لگے رہتے ہیں۔

موسیقی کئی ایک زاویہ ہائے نگاہ سے قابل مطالعہ ہے:

(۱) یہ چیز انسانی جسم کو نقصان پہنچاتی ہے اور انسان کے اعصابی نظام پر بُرے

اثرات چھوڑتی ہے انہیں مدِّ نظر رکھتے ہوئے کولمبیا یونیورسٹی کا پروفیسر ڈاکٹر ولف اڈلر کہتا ہے:

موسیقی کی بہترین اور دلکش ترین تانیں انسان کے اعصاب پر بدترین اثرات چھوڑتی ہیں اور بالخصوص جب موسم گرما ہو تو ان کے ناخوشگوار اثرات زیادہ شدید ہوتے ہیں۔

عضویات اور حیاتیات کا مشہور ماہر فرانسیسی ڈاکٹر الیکسس کارل کہتا ہے:

ممکن ہے حیوانی شہوات کی تکمیل کچھ اہمیت کی حامل ہو لیکن جو زندگی تفریح میں گزرے اس سے زیادہ غیر معقول چیز اور کوئی نہیں۔

ہوش اور قوتِ عقل میں عام کمی الکحل کی تاثیر اور بالآخر عادت میں بے نظمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بلاشبہ فلم ریڈیو ٹیلی وژن اس فکری بحران میں حصّہ دار ہیں۔

موسیقی کو بالعموم مخدر (سن یا بے حس کرنے والا) مواد شمار کرنا چاہیے کیونکہ اس کے تخدیری اثرات کسی وجہ سے بھی قابلِ انکار نہیں۔ تخدیر کی بھی کئی قسمیں ہیں اور انسان مختلف طریقوں سے اپنے اعصاب کی تخدیر کرسکتا ہے۔

بعض اوقات تخدیر خوراک کے ذریعے ہوتی ہے مثلاً الکحلی مشروبات اعصاب میں شدید تخدیر پیدا کرتے ہیں اور انسان کی عقل و ہوش کی قوت کو معطل کر دیتے ہیں اور بعض اوقات تخدیر کسی چیز کو ناک کے راستے بدن میں کھینچ کر پیدا کی جاتی ہے مثلاً ہیروئن کا سفوف جسے نتھنوں کے ذریعے بدن میں جذب کیا جاتا ہے وہ کچھ عرصے کے لیے اعصاب کو سن کر دیتا ہے اور بہت سے ایسے مریض جنہیں تخدیر کی ضرورت ہوتی ہے ان کی رگوں میں مخدر مواد انجکشنوں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔

بعض اوقات یہی تخدیر کانوں کے راستے عمل میں آتی ہے اور موسیقی اور کنسرٹ (CONCERT) کے سننے سے سامعین کے اعصاب پر تخدیری اثر پیدا ہوتا ہے اور یہ اثر کبھی کبھی اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان کو تخیر زدہ افراد کی طرح اس کی طبعی حالت سے باہر لے آتا ہے اور ہر چیز کی جانب سے اس کی توجہ سلب کر لیتا ہے۔

اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ اس امر کی تصدیق کریں گے کہ موسیقی

ایک مخدر کے علاوہ کچھ نہیں اور تخدیر کے تمام یابہت سے عیوب اور نقصانات کی حامل ہے۔

اصولاً لوگ موسیقی سے جو غیر معمولی لذّت حاصل کرتے ہیں وہ اسی تخدیری اثر کی وجہ سے ہے۔ بعض اوقات یہ اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ انسان اس حد تک اپنی عقل و ہوش کھودیتا ہے کہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

مثلاً جب موسیقی کی تخدیر قوی ہوجائے تو انسان کی صحیح فیصلہ کرنے کی قوت سلب ہوجاتی ہے۔ پھر وہ بھلے برے کا صحیح ادراک نہیں کرسکتا کیونکہ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جب وہ صوتی کشش کے بر اثر عوامل سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی عقل و فکر اور قوتِ تمیز موسیقی کی تند تانوں کی سرمستی کی اسیر ہوجاتی ہے تو وہ بہت سے ایسے ناشائستہ کام کرتا ہے جن کا عام حالات میں مرتکب ہونا اپنی شان اور انسانیت کے منافی سمجھتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ہماری گفتگو کا یہ حصہ کسی مثال یا نمونے کا محتاج نہیں کیونکہ ہر سمجھدار شخص جانتا ہے کہ وہ ڈنرکی پارٹیاں جہاں غیر مرد غیر عورتوں کے ساتھ ناچنے میں مشغول ہوتے ہیں، ہمیشہ موسیقی کی تیز سروں سے مربوط ہوتی ہیں اور موسیقی کی سروں کا ارتعاش لوگوں کی عقل اور سوجھ بوجھ پر یوں پردہ ڈال دیتا ہے کہ ان کے لیے انسانیت کے مقام سے گرا ہوا ہر کام انجام دینا سہل اور آسان ہوجاتا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کون سی تخدیر ہوسکتی ہے کہ جب موسیقی کی آواز کا زیر و بم انسان پر اثر کرتا ہے تو اس کے اعصاب پر ایک قسم کی سستی طاری ہوجاتی ہے اور اس عقل کے اندھے کو انسانی تصورات میں سے شہوت رانی، عشق بازی اور جمال پرستی کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھتا۔ اس کی عقل اور قوت ادراک پر یوں پردہ پڑجاتا ہے کہ وہ رحم، مروت، عفت، حیا، امانت، مساوات، برادری، بزرگی و عظمت، کوشش و محنت، مقصد کے حصول کے لیے جنگ اور ثابت قدمی جیسے مقدس تصورات کو یکسر بھلا بیٹھتا ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ روزِ اوّل سے الکحل اور موسیقی شہوت پرست مردوں اور عورتوں کے لیے عیاشی کا سب سے بڑا وسیلہ رہی ہیں اور وہ خاص مواقع پر اعصاب کی تخدیر کے لیے انہیں کا سہارا لیتے رہے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اسلام انسان کو فطری لذتوں سے ہرگز باز نہیں رکھتا لیکن وہ ان وقتی لذّتوں سے روکتا ہے جو اعصاب کی تخدیر اور شہوانی خواہشات کی تحریک کے ذریعے پیدا ہوں اور انسان کو اس کی فطری حالت سے دور کردیں۔

موسیقی کی اخلاقی حدود

کیا اس میں بھی کوئی کلام ہے کہ اخلاقی انحطاط کے عوامل میں سے ایک عامل یہی تحریریں ہیں اور کیا موسیقی کی دل فریب تانیں برائیوں کی اشاعت اور منافی عفت اعمال تک اپنا دامن نہیں پھیلاتیں؟ کیا عورتوں اور لڑکیوں کی مسحور کن آواز موسیقی کے شہوت انگیز سروں کے ساتھ مل کر جوانوں میں عشق بازی کا ولولہ پیدا نہیں کرتی؟ اور پھر جو قلب شہوت انگیز نغموں اور عاشقانہ تحریروں سے لبریز ہو جائے کیا اس میں یادِ خدا کے لیے جگہ باقی رہ جاتی ہے؟ کیا وہ دل جو عاشقانہ آوازوں اور موسیقی کی موجوں کے ارتعاش کے بھنور میں ڈوب جائے وہ محتاجوں اور مسکینوں کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟

اصولاً یہ دیکھنا چاہیے کہ موسیقی کی محفلوں کے لوازمات اور مواقع کیا ہوتے ہیں اور موسیقی کے زیر و بم اور مختلف ارتعاشات کے تقاضے کیا ہیں؟ ان میں رقص و سرود عورتوں اور مردوں اور لڑکیوں لڑکوں کے اختلاط اور شراب و کباب کے سوا کچھ اور بھی ہوتا ہے؟ اور جو چیز یہ خراب نتائج پیدا کرے کیا ایک آسمانی شریعت اسے حلال قرار دے سکتی ہے؟

حاصل کلام یہ ہے کہ موسیقی کی تانیں اعصاب کی تخدیر کے سلسلے میں بھی مضر اثرات رکھتی ہیں اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بھی انسان کے اندر شہوانی خواہشات کو ابھارتی ہیں۔

حفظانِ صحت کی رو سے بھی ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارے دور میں ناگہانی اموات کی تعداد بڑھ جانے کے مختلف عوامل اور وجوہ میں سے ایک موسیقی کا رواج بھی ہے کیونکہ موسیقی ہیجان پیدا کرتی ہے اور ہیجان کے معنی اعصاب کا توازن بگڑ جانے کے ہیں۔

جن لوگوں کے اعصاب پر دن رات موسیقی کے گوناگوں نغموں کی بمباری ہوتی رہے وہ حرکت قلب بند ہونے اور دماغ کی رگ پھٹنے سے زیادہ دور نہیں ہوتے۔

یہاں یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ انسانی بدن کے اعصاب مسلسل ہیجان کی وجہ سے بہت جلد بیکار ہو جاتے ہیں۔

یہ تھا موسیقی کے نقصانات کا ایک پہلو۔

خدا کی جانب سے بندوں کی آزمائش کا کیا مقصد ہے؟

سوال: خدا قرآن مجید میں فرماتا ہے:
اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ
تم میں سے کون زیادہ نیکوکار ہیں[1]
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امتحان کی حاجت تو اسے ہوتی ہے جو کسی کام کی کیفیت اور انجام سے واقف نہ ہو۔ جب خدا کے لیے ظاہر اور پوشیدہ برابر ہیں اور آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز اس سے مخفی نہیں تو اسے بندوں کا امتحان لینے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: یہ بات اجمالی طور پر ذہن میں رکھنی چاہیے کہ امتحان الٰہی کا مقصد اور معانی کچھ اور ہیں۔ خود انسان اپنی کوتاہی اور عقل کی نارسائی کی بنا پر حقیقت دریافت کرنے اور ہر قسم کا ابہام دور کرنے کے لیے آزمائش کرنے پر

---

[1] سورۃ ملک۔ آیت ۲

مجبور ہے لیکن چونکہ ایسی حالت خدا کے لیے محال ہے اور وہ اپنے لامحدود علم کی روشنی میں تمام امور سے آگاہ ہے لہٰذا اس کے بارے میں امتحان ان معنوں میں قرینِ عقل نہیں ہے بلکہ اس کا بندوں کی آزمائش کرنا کسی اور معنی میں اور کسی اور مقصد کے لیے ہے جس کی تشریح درج ذیل ہے:

① اس کی توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ جب انسان جنم لیتا ہے تو اس کی فطرت میں بہت سی صلاحیتیں اور حیرت انگیز امکانات موجود ہوتے ہیں۔ تمام انسانی کمالات اور اخلاقی فضائل استعداد کی شکل میں اس کے وجود میں چھپے ہوتے ہیں اور اس کی سرشت کا خمیر انہیں سے گندھا ہوتا ہے۔ یہ صلاحیتیں زیرِ زمین سوتوں کی مانند ہوتی ہیں جو مخصوص وسائل کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے اور قوت اور استعداد کے مرحلے تک نہیں پہنچتے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ جب تک یہ صلاحیتیں ظاہر نہ ہوں اس وقت تک ارتقاء اور فضیلت اور اس کے نتیجے میں جزا اور ثواب ظاہری وجود حاصل نہیں کر سکتے۔ ایسی آزمائش کا مقصد انسانوں کی تربیت اور ان کے وجود میں عالی انسانی صفات کا پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ اگر یہ ذمے داریاں اور آزمائشیں نہ ہوتیں تو انسانوں کے وجود میں صلاحیتیں ہرگز ظاہر نہ ہوتیں اور کوئی شخص صلہ کا مستحق نہ ہوتا۔

یہ حقیقت امیرالمومنین امام علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں ایک مختصر لیکن پر معنی جملے میں بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"یہ ہرگز نہ کہو کہ خدایا! میں امتحان اور آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں کیونکہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو آزمائش میں نہ ڈالا جائے۔" بلکہ دعا مانگتے وقت یہ کہو کہ: اے خدا! میں گمراہ کن آزمائشوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں (یعنی وہ آزمائشیں جن سے میں عہدہ برآنہ ہو سکوں اور ان کے ذریعے اپنے آپ کو کامل نہ بنا سکوں)۔

بعد میں امام علی علیہ السلام اس کی یوں توضیح فرماتے ہیں کہ:

امتحان اور آزمائش سے مراد اطلاع اور آگاہی حاصل کرنا نہیں ہے

کیونکہ دنیا میں کوئی چیز خدا سے ڈھکی چھپی نہیں بلکہ :

لِيَتَبَيَّنَ السَّاخِطَ لِرِزْقِهِ، وَالرَّاضِيَ بِقِسْمِهِ، .....
وَلٰكِنْ لِتَظْهَرَ الْاَفْعَالُ الَّتِيْ بِهَا يُسْتَحَقُّ الثَّوَابُ وَالْعِقَابُ،[۱]

مقصد یہ ہے کہ اندرونی صفات مثلاً رضا اور خوشنودی اور غضب یا خشم کا جو حصہ خدا نے دیا ہو وہ ظاہر ہو جائے اور یہ باطنی صفات فعل اور خارجی عمل کی صورت میں ظاہر ہوں تاکہ ثواب اور عقاب اور کیفر اور پاداش کا استحقاق واضح ہو جائے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا امام علیہ السلام نے امتحان کا مقصد یہ بتایا ہے کہ امتحان کی بدولت انسان کی باطنی صفات اور صلاحیتیں خارجی عمل کی شکل اختیار کر لیں اور اندرونی صفات کے خارجی عمل اور فعل کی شکل میں مجسّم ہو جانے کے بعد افراد جزا اور سزا کے قابل ٹھہریں ورنہ فقط اندرونی صفات کی بنا پر (خارجی عمل کے بغیر) نہ جزا دی جاسکتی ہے نہ سزا اور در حقیقت اس صورت میں کاملیت تشکیل پذیر نہیں ہوتی۔

مثلاً جب خدا حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ جاننا نہیں کہ آیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے فرمان کی اطاعت کرتے ہیں یا نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے احکام کے بارے میں فرمانبرداری اور تسلیم کی جو روح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر موجود تھی وہ اسے پروان چڑھائیں اور فعلیت کے مرحلے پر پہنچائیں اور یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کاملیت کی راہ پر گامزن ہو جائیں (غور فرمائیں)۔

لہٰذا خدا مشکلات اور سختیوں کے ذریعے بنی نوع انسان کی آزمائش کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

"ہم تمہیں خوف، بھوک، اموال، نفوس اور پھلوں کے نقصان سے

۱۔ نہج البلاغہ محمد عبدہ مصری کلمات قصار شمارہ ۹۳

آزماتے ہیں۔ صبر کرنے والے افراد کو خوشخبری دے دیجئے۔"

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۵)

مشکلات اور دشواریاں ایک بھٹی کی مانند ہیں جو لوہے کو سخت اور مضبوط بناتی ہے۔ انسان بھی حوادث اور مشکلات میں طاقتور اور قوی ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی اور خوش بختی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اپنے بندوں کا امتحان لینے سے خدا کا مقصد ان کے وجود میں عالی صفات کی تربیت اور پرورش ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جن افراد کا امتحان لیا جائے وہ سب کے سب لازماً یہ مقصد حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے وجود میں پسندیدہ انسانی صفات نشو و نما پاتی ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ امتحانِ خداوندی محیطِ زندگی میں تربیت اور پرورش کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جو لوگ نیک بختی کے خواہش مند ہوں وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس راستے میں خاص تربیت حاصل کر لیتے ہیں لیکن کچھ لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کی بری اور مذموم باطنی صفات ظاہر ہوتی ہیں اور ان کی بداعمالیوں کی شکل میں مجسّم ہو جاتی ہیں۔ اصطلاحاً وہ اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

امتحاناتِ الٰہی کے اسرار میں سے ایک یہ ہے:

(۲) امتحانِ خداوندی کا دوسرا ثمرہ جو اجتماعی امتحانات سے مربوط ہے یہ ہے کہ تربیت کے موضوع کے علاوہ اس کے ذریعے صالح اور فاسد، مومن اور منافق اور اچھے اور بُرے افراد پہچانے جاتے ہیں۔ قرآنِ مجید اس نکتے کی جانب لفظ "تمحیص" کے ذریعے اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ:

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۔

(سورۂ آلِ عمران آیت ۱۴۱)

خدا باایمان افراد کو آزمائش کے ذریعے کافروں کے طبقے سے جدا کرتا ہے اور یہ دو گروہ ایک دوسرے سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

(۳) امتحانِ الٰہی کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ ان جھوٹے مدعیوں کے لیے اتمامِ حجت

ہے جو عام مواقع پر ہزاروں قسم کے دعوے کرتے ہیں اور جب عمل کا وقت آتے تو ناکارہ ثابت ہوتے ہیں یعنی صرف گفتار کے غازی ہیں کردار کے نہیں۔ امتحان اور آزمائش کی بدولت ان کی قلعی کھل جاتی ہے۔

اگر اس قسم کے لوگ امتحان کی بھٹی میں نہ پڑیں اور اپنے اس کھوکھلے باطن کو آشکارا نہ کریں جو ان کے آراستہ و پیراستہ ظاہر کے برعکس ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور دوسروں کو بھی مغالطے میں مبتلا رکھیں اور خدا کی جانب سے دی جانے والی سزا یا الطافِ الٰہی سے محرومی کو ظالمانہ فرض کریں لیکن امتحان ان کی اصلیت کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور ان کے وجود کی حقیقت خود ان پر اور دوسروں پر واضح ہو جاتی ہے۔

یہ ہے امتحاناتِ الٰہی کا فلسفہ۔

جو مٹی جراثیم سے آلودہ ہو اس پر تیمم کیسے کیا جا سکتا ہے؟

سوال: اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ جب پانی میسر نہ ہو تو غسل اور وضو کے بجائے مٹی پر تیمم کیا جائے لیکن مٹی پر کیسے تیمم کیا جا سکتا ہے جب کہ اس میں انواع و اقسام کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے منتقل بھی ہو سکتے ہیں؟

جواب: جیسا کہ علوم طبیعی سے ثابت ہو چکا ہے پاک صاف مٹی جراثیم سے محفوظ ہوتی ہے اور اکثر جراثیم مٹی میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ مٹی کی اس مصئونیت کی وجہ وہ بہت ہی چھوٹے جاندار موجودات ہوتے ہیں جو مٹی میں وجود رکھتے ہیں۔ یہ موجودات نقصان دہ جراثیم کے جانی دشمن ہوتے ہیں مثلاً اگر ایک لاش جس میں لاکھوں کروڑوں جراثیم موجود ہوں مٹی میں دفن کر دی جائے تو یہ ننھے ننھے جاندار فوراً اس لاش کی تحلیل شروع کر دیتے ہیں اور بہت جلد جراثیم کی فوج کو شکست دے کر اس کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔

لہٰذا جو کچھ تصور کیا گیا ہے اسکے برعکس پاک اور آلودگی سے مبرا مٹی نہ صرف یہ کہ جراثیم کے اثرات سے محفوظ ہوتی ہے بلکہ ان کی جانی دشمن ہے اور جلد یا بدیر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

اس اہم حقیقت کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی میسّر نہ ہونے کی صورت میں مٹی پر تیمم کرنے کے بارے میں اسلام کا حکم طبیعی علوم کے انکشافات کے عین مطابق ہے۔

وہ بنیادی نکتہ جس کی جانب اس سلسلے میں پوری پوری توجہ دینی چاہیے یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں تیمم سے متعلقہ آیت میں مٹی کے پاکیزہ ہونے کے بارے میں بے حد تاکید کی گئی ہے۔ اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے:

"اگر تمہیں پانی میسّر نہ ہو تو پاکیزہ اور صاف ستھری مٹی پر تیمم کرو۔" [1]

اس مذہبی حکم کے متعلق ائمہ طاہرین علیہم السلام سے جو روایات نقل کی گئی ہیں ان میں تیمم کی مٹی کی پاکیزگی اور صفائی ستھرائی کی واضح طور پر سفارش کی گئی ہے۔ کتاب "وسائل الشیعہ" میں اس بارے میں امام صادق علیہ السلام سے دو حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔

آپ نے فرمایا: "تیمم کی مٹی ان جگہوں سے حاصل نہ کرو جو گزرگاہیں ہوں اور جن پر لوگ آمد و رفت رکھتے ہوں۔" [2]

یہ تاکید اس لیے کی گئی ہے کہ عموماً ایسی جگہوں کے آلودہ اور پراگندہ ہونے کا امکان ہوتا ہے لیکن جن جگہوں پر لوگوں کی آمد و رفت نہ ہو اور نتیجتہً وہ دسترس سے دور ہوں وہ عموماً صاف ستھری اور پاکیزہ ہوتی ہیں۔

---

[1] فَتَیَمَّمُوْ صَعِیْدًا طَیِّبًا (سورہ نساء آیت ۴۳)

[2] وسائل الشیعہ۔ کتاب طہارۃ۔ باب تیمم

کیا دوسرے مذاہب برحق ہیں ؟

سوال: جب اسلام دوسرے مذاہب کا ناسخ ہے تو پھر وہ قرآن مجید کی کچھ آیات میں دنیا کے تمام افراد اور اقوام کو ـــــ خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی اور عیسائی وغیرہ ـــــ اگر وہ خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور نیک اعمال کریں تو اہلِ نجات کیوں سمجھتا ہے اور کہتا ہے: "ایسے افراد کے لیے قیامت کے دن کسی خوف اور پریشانی کا وجود نہیں" کیا ان آیات کا یہ مفہوم نہیں کہ دنیا کی تمام اقوام طلوعِ اسلام کے بعد بھی مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اہلِ نجات ہیں اور اب بھی ان کی شریعتیں اپنی قوت کے ساتھ باقی ہیں اور درجۂ اعتبار سے ساقط نہیں ہوئیں؟"

جواب: لازم ہے کہ پہلے مذکورہ بالا آیات کے متون کا ذکر کیا جائے اور پھر ان کا تجزیہ اور تحلیل کی جائے۔

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

(سورۂ بقرہ آیت ۶۲)

جو لوگ ایمان لائے ہیں (مسلمان) اور یہودی، عیسائی اور صابئین جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے، وہ خدا کی بارگاہ سے اجر پائیں گے اور ان کے لیے ہرگز خوف اور پریشانی نہیں ہے۔

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (سورۂ مائدہ آیت ۶۹)

معنی کے لحاظ سے اس آیت اور پہلی آیت میں کوئی فرق نہیں۔

(۳) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئِیْنَ وَالنَّصٰرٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۖ اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ

(سورۂ حج آیت ۱۷)

خدا با ایمان لوگوں (مسلمانوں) یہودیوں، صابیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں اور جو لوگ مشرک ہیں ان کے بارے میں قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ بلاشبہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ممکن ہے کہ بادی النظر میں یہ خیال کیا جائے کہ یہ آیات بتاتی ہیں کہ مذکورہ بالا مذاہب کے پیرو اگر توحید اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں اور نیک اعمال کرتے ہوں تو اہلِ نجات ہیں اور اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ابھی دوسرے مذاہب منسوخ نہیں ہوئے اور اب جب کہ اسلام بنی نوع انسان کے لیے پیش کیا گیا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے مذاہب کی پیروی منسوخ ہوگئی ہے بلکہ سابقہ مذاہب میں سے

ہر ایک خدا کی جانب ایک راستہ ہے اور انسان جس راستے سے بھی چاہے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے اور یہ قطعاً ضروری نہیں کہ ایک خاص شریعت مثلاً اسلام کی پیروی کرے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو ایسے افراد کی طرف سے بار بار پیش کیا گیا ہے جن کا قرآن مجید کا مطالعہ سطحی ہے۔

تاہم یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کسی ایک آیت کی تفسیر کی بنیاد اس بات پر نہیں ہوتی کہ دوسری آیات سے چشم پوشی کی جائے اور اس آیت کا ارتباط ان سے قطع کر دیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ایک آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے شانِ نزول کے علاوہ اس سے قبل اور بعد کی آیات اور قرآن مجید کی دوسری آیات کو بھی مدِنظر رکھا جائے۔

اگر دینِ اسلام کے ظہور کے بعد دوسرے مذاہب کی پیروی مروج تھی تو علاوہ اس کے کسی دوسرے مذہب کی شریعت کو اسلام کے نام سے جاری رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا یہ بھی ہرگز ضروری نہ تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ دنیا کی تمام اقوام کے سربراہوں اور لیڈروں کو تبلیغی خطوط لکھیں اور سب کو اپنے مذہب کی دعوت دیں اور اپنے مذہب کو ایک آفاقی مذہب اور اپنی شریعت کو آخری شریعت کے طور پر پیش کریں۔

رسولِ اکرمؐ کے خطوط اور آپ کا بار بار اسلام کی دعوت دینا آنحضرتؐ کے زمانے میں اور اس کے بعد مسلمانوں کا اہل کتاب کے خلاف طاقت فرسا جہاد اور وہ روایات جو اس سلسلے میں ہمارے ائمۂ اہلبیت علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں سب اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ اسلام کے ظہور کے ساتھ سابقہ انبیائے کرامؑ کی رسالت کا دور ختم ہو گیا اور اسلام کی رسالت کے علاوہ کوئی رسالت اور حضرت محمدؐ کی نبوّت کے علاوہ کوئی نبوّت وجود نہیں رکھتی

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ان آیات کی غایت کیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں دو حقیقتیں بیان کی گئی ہیں ___ ایک اجمالی اور دوسری تفصیلی ___

(۱) اگر یہودی اور عیسائی سچے دل سے توحید اور قیامت کے معتقد ہوں اور ظاہرداری نہ کریں تو انہیں چاہیے کہ تورات اور انجیل کے مطابق پیغمبرِ اسلامؐ پر ایمان لے آئیں کیونکہ تورات اور انجیل نے آنحضرتؐ کے آنے کی بشارت دی ہے اور آپکی

علامتیں یوں بیان کی ہیں جیسے کہ وہ آپ کو اپنے فرزندوں کی مانند پہچانتے ہوں۔[1]
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے یہ حقیقت سورۂ مائدہ میں زیر بحث آیت سے پہلے بیان کی ہے اور فرماتا ہے:

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط (سورۂ مائدہ آیت ۶۸)

اے اہلِ کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل اور جو کچھ خدا کی طرف سے تمہارے لیے نازل کیا گیا ہے اسے قائم نہیں رکھو گے اس وقت تک کسی جگہ نہیں پہنچو گے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان آسمانی کتابوں کو قائم رکھنے سے مراد ان کے مندرجات پر عمل کرنا ہے اور ان کتابوں کے مندرجات میں سے ایک پیغمبر اکرمؐ کی نبوت اور آفاقی رسالت ہے جو ان کتابوں میں وارد ہوئی ہے اور جس کی طرف قرآن مجید نے بارہا اشارہ کیا ہے۔ اگر وہ اللہ اور روزِ قیامت پر واقعی ایمان رکھتے ہوں تو انہیں چاہیے کہ آنحضرتؐ کی آفاقی رسالت پر بھی ایمان لائیں جو کتبِ عہدین (عہدنامۂ قدیم اور عہدنامہ جدید) کی الٰہی تعلیمات کا حصّہ ہے۔ اس صورت میں وہ مسلمانوں کے جزو بن جائیں گے اور یقیناً اجر پائیں گے۔

المختصر اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان، آسمانی کتابوں اور ان کی تعلیمات پر ایمان سے (جن میں خاتم النبیینؐ کی نبوت شامل ہے) الگ نہیں ہے اور پھر ایک ایسا شخص جو ان معنوں میں ایمان لایا ہو اصطلاحاً عیسائی نہیں کہلا سکتا بلکہ مسلمان تصوّر ہوگا۔

(۲) سورۂ بقرہ کی اس آیت سے پہلے کی آیات کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت کا تعلق اہلِ کتاب کے اس گروہ سے ہے جو سابقہ پیغمبروں کے زمانے میں خدا پر ایمان لائے اور روزِ قیامت کے معتقد تھے اور اُس زمانے میں اپنے

---

[1] سورۂ بقرہ اور سورۂ انعام (آیات ۲۰ اور ۱۴۶) ملاحظہ ہوں۔

اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں بعض دوسروں نے راہِ توحید سے سرتابی کی اور بچھڑے کی پرستش کرنے لگے اور بے شرمی کی اس حد تک پہنچ گئے کہ حضرت موسیٰؑ سے صاف صاف کہہ دیا: جب تک ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ہم اس کی عبادت ہرگز نہیں کریں گے۔ ایسے نازیبا طور طریقوں کے نتیجے میں بنی اسرائیل خشم الٰہی سے دوچار ہو گئے اور اس آیت سے پہلی آیت کے مفہوم کے مطابق ذلت اور بیچارگی کی مہر ان کی پیشانی پر داغ دی گئی اور وہ غضبِ الٰہی میں گرفتار ہو گئے کیونکہ وہ آیاتِ الٰہی کے بارے میں کفر کے مرتکب ہوئے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ [1]

خدا نے مذکورہ بالا آیات غلط فہمی دور کرنے کے لیے اور یہ واضح کرنے کے لیے بیان فرمائی ہیں کہ اہلِ کتاب کا جو گروہ واقعی توحید اور قیامت پر یقین رکھتا تھا اور اچھے اعمال کرتا تھا اس کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے۔ وہ قیامت کے دن نجات پائیں گے اور ان کے لیے کوئی پریشانی اور غم نہ ہوگا۔

اس صورت میں یہ آیت اہل کتاب کے اس گروہ سے مخصوص ہوگی جو سابقہ ادوار میں زندہ تھے اور پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے اور اس کا پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانے سے کوئی تعلق نہیں۔

اس آیت کی شانِ نزول بھی اس موضوع کو مکمل طور پر واضح کر دیتی ہے کہ رسول اکرمؐ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کے بعد بعض مسلمان اس سوچ میں پڑ گئے کہ جب فقط اسلام ہی سچائی اور نجات کا واحد راستہ ہے تو ہمارے ان آباو اجداد کا کیا حشر ہوگا جو دوسرے مذاہب کے پیرو تھے۔ اس موقع پر مذکورہ آیت شریفہ نازل ہوئی

---

[1] وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ (سورہ بقرہ آیت ۶۱)

اور رسمی طور پر اعلان کر دیا گیا کہ وہ تمام لوگ جو اپنے زمانے میں اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے وہ اہلِ نجات ہوں گے اور ان کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

جب حضرت سلمان فارسیؓ پہلی بار رسولِ اکرمؐ کے حضور میں شرفیاب ہوئے تو موصل کی خانقاہ کی کفالت کرنے والوں اور راہبوں کا ذکر چھیڑا اور اس حالت میں کہ کئی ایک لوگ آنحضرتؐ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھے تھے آپ سے مخاطب ہو کر عرض کیا:

"موصل کی خانقاہ کے تمام راہب آپ کی بعثت کے انتظار میں تھے لیکن افسوس سے عرض کرنا پڑتا ہے کہ وہ آپ کی زیارت کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔"

اس وقت کسی نے حضرت سلمانؓ سے کہا کہ وہ تو اہلِ آتش تھے۔ یہ بات حضرت سلمانؓ پر گراں گزری۔ اس موقع پر زیرِ بحث آیت نازل ہوئی اور اعلان کیا کہ جو لوگ گزشتہ سچے مذاہب پر حقیقی ایمان رکھتے تھے اگرچہ انھوں نے آنحضرتؐ کا پُر فضیلت زمانہ نہ بھی دیکھا ہو پھر بھی وہ اہلِ نجات ہوں گے۔

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ پیغمبرِ اسلامؐ سے پہلے اپنے زمانے کے سچے مذہب پر پختہ ایمان رکھتے تھے وہ قیامت کے دن اہلِ نجات ہوں گے۔ اس صورت میں یہ آیت "صلح کل" (ہر مذہب کے پیرو اہلِ نجات ہیں) جیسے خیالات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور اس کی اس قسم کی تفسیر اس آیت اور اس سے مربوط آیات کے مفہوم سے لاعلمی کی علامت ہے۔

علاوہ ازیں سورۂ حج کی ۱۷ویں آیت ان کے اخذ کردہ مطلب سے رتی بھر مطابقت نہیں رکھتی اور اس کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ خدا قیامت کے دن دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ یہ قول اس امر کی ہرگز گواہی نہیں دیتا کہ دنیا کے تمام مذاہب کے پیرو قیامت کے دن اہلِ نجات ہوں گے اور سبھی راہِ حق پر گامزن ہیں۔[1]

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیرِ نمونہ (فارسی) ملاحظہ فرمائیں۔

صراطِ مستقیم کی جانب ہدایت کا تقاضا

سوال: اس امر کے باوجود کہ پیغمبرِ اسلامؐ خود بھی راہِ راست پر تھے اور مسلمانوں کو بھی سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت فرماتے تھے آپ نماز کے دوران یہ کیوں کہتے تھے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" یعنی ہماری رہنمائی سیدھے راستے کی جانب فرما۔ کیا علمی اصطلاح کے مطابق یہ تحصیل حاصل نہیں ہے؟

جواب: جہانِ ہستی اپنے تمام مظاہر کے ساتھ ـــــ خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی ـــ زوال پذیر اور تغیر و تبدل سے دوچار ہے۔ جس طرح ایک مظہر کی پیدائش علت اور خاص شرائط کی بدولت تشکیل پاتی ہے اسی طرح اس کے وجود کے اجراء اور استمرار کے لیے بھی خاص شرائط اور انتظامات ضروری ہیں جو اسے استمرار اور بقا کا لباس پہنا دیں اور اس کے زوال اور تباہی کی روک تھام کریں۔
براہِ راست ہدایت کا موضوع بھی اسی قانون کے تابع ہے۔ ہدایت خواہ فرد کی ہو یا معاشرے کی اس کی بقا اور استمرار کے لیے خاص احتیاط اور شرائط کی ضرورت ہے ورنہ یہ ممکن

ہے کہ ایک ہدایت یافتہ شخص بعد میں راہِ راست سے بھٹک جائے اور ہدایت کے بعد دوبارہ گمراہ ہو جائے۔

لہٰذا ایک فرد اور ایک جماعت خواہ موجودہ حالات میں ہدایت اور عقائد کی رُو سے عالی اور ممتاز رتبہ کیوں نہ حاصل کرے لیکن اس کا مستقبل مبہم ہوتا ہے۔ اسے چاہیے کہ موجودہ کیفیت سے استفادہ کرے اور بارگاہِ الٰہی میں پیش ہو کر خلوص دل سے دعا کرے کہ وہ اس نعمت کو جس کے زوال اور فنا کا شکار ہونے کا ہر لحظہ امکان ہے اس کے حق میں زندگی کے تمام ادوار میں برقرار رکھے۔

پس اگر ایک ہدایت یافتہ شخص کہتا ہے کہ بارِ الٰہا! سیدھے راستے کی جانب ہماری رہنمائی فرما تو اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں اس راستے پر "ثابت قدم" رکھ اور اس نعمت کو ہمارے لیے دائمی بنا دے۔

اسلام کے بزرگ مفسر علامہ طبرسی مجمع البیان میں ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں: اور ایسی تعبیرات کی مثالیں ہمارے درمیان بہت ہیں۔ جب آپ کو یہ احساس ہو کہ آپ کا عزیز مہمان آہستہ آہستہ غذا سے ہاتھ کھینچنا چاہتا ہے تو آپ فوراً اس سے کہتے ہیں: 'تناول فرمایئے' جبکہ وہ آہستہ آہستہ کھانے میں مشغول ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ آپ اس کام کو جاری رکھیں۔[1]

---

[1] مزید معلومات کے لیے آیت اللہ العظمیٰ الخوئی کی تفسیر سورۃ الحمد، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی صفحہ ۷۰ سے ۷۶ تک ملاحظہ فرمایئے۔

آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا کیا مقصد ہے؟

سوال: خداوند تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے: "اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ" یعنی تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔[1] یہاں چھ دنوں سے کیا مراد ہے جب کہ اس وقت نہ دن تھا اور نہ رات تھی؟ علاوہ ازیں خدا نے انہیں ایک لحظے میں کیوں پیدا نہیں کیا؟

جواب: مندرجہ بالا سوال دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ یہ ہے کہ چھ روز سے کیا مراد ہے جب کہ ابتدائے آفرینش میں دن اور رات تھے ہی نہیں!

اس حصے کا جواب یہ ہے کہ اصولاً لفظ "یوم" جس کا اردو میں مترادف کلمہ دن ہے ہر مقام پر مناسبت کے لحاظ سے مخصوص معنوں کا حامل ہوتا ہے۔ عموماً یہ لفظ "دن" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو "رات" کی ضد ہے اور قرآنِ مجید میں بھی زیادہ تر انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن کبھی کبھی دَور کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اگر کسی چیز کے مختلف ادوار ہوں تو ہر دَور پر لفظ 'یوم' کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بوڑھا شخص کہتا ہے:

---

[1] سورۂ اعراف۔ آیت ۵۴

ایک دن میں بچہ تھا ۔ ایک دن جوان بھی تھا ۔ لیکن آج کے دن بوڑھا ہو گیا ہوں ۔ چونکہ یہ ادوار زنجیر کی کڑیوں کی مانند ایک دوسرے سے تین عام دنوں کی طرح پیوستہ ہیں اس لیے وہ زندگی کے ان تین مختلف ادوار کو لفظ "دن" سے تعبیر کرتا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "اَلدَّھرُ یَومَانِ ۔ یَومٌ لَکَ وَیَومٌ عَلَیکَ"۔ یعنی زمانہ دو دنوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک دن وہ تجھے نفع پہنچاتا ہے اور دوسرے دن تیرے نقصان کے درپے ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے دو مختلف دور ہوتے ہیں۔ ایک دن وہ مقدر کی بلندی پر ہوتا ہے اور دوسرے دن مشکلات میں گرفتار ہوتا ہے۔

بقول بہادر شاہ ظفر ؎

عمر دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

بلاشبہ "دن" سے ظفر کی مراد بھی "دور" ہی ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس کی رو سے چھ دن جن میں زمین و آسمان تخلیق کیے گئے ہیں وہ چھ ادوار ہیں جن سے زمین و آسمان موجودہ صورت میں آنے سے پہلے گزرے ہیں یعنی زمین اور اجرام فلکی کی موجودہ وضع قطع ان مسلسل تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو ان میں رونما ہوئی ہیں اور بالآخر یہ تمام مراحل طے کر کے انہوں نے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ اب ممکن ہے کہ ایک دور کی مدت ایک کروڑ سال یا ایک ارب سال رہی ہو۔

سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ خدا نے ان سب کو بیک وقت کیوں نہ پیدا کر دیا اور ان کی خلقت تدریجی کیوں عمل میں آئی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ مادی دنیا ہے اور تدریجی ارتقا کا شمار مادی موجودات کی لاینفک روایات میں ہوتا ہے اور مادی چیزیں فطری طور پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک شکل سے دوسری شکل میں آتی ہیں اور یوں

مختلف مراحل طے کرتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہ ایک کامل مظہر بن جاتی ہیں اور زمین اور آسمان بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

مادی موجودات میں سے آپ جس پر بھی نظر ڈالیں یہ دیکھنے میں آئے گا کہ وہ سب کے سب بتدریج ارتقا کی سیڑھی کے ذریعے اوپر جا رہے ہیں۔ گھاس اور پودے کچھ مدت گزرنے کے بعد ایک پھولدار جھاڑی یا پھلدار درخت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمین میں پوشیدہ معادن اور منابع طویل عمل اور ردِّ عمل کے بعد ایک معدنی مادے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حیوان اور انسان جب تک ایک مخصوص مدت کے لیے رحم میں جنینی کا دور پورا نہ کریں وسیع تر دنیا میں زندگی نہیں گزار سکتے۔ یہ قانون ہر جگہ اور مادی دنیا کی ہر چیز پر حکومت کرتا ہے۔

سات آسمانوں سے کیا مراد ہے ؟

سوال: سات آسمانوں کی طرف اشارہ کرنے سے قرآن مجید کا کیا مقصد ہے ؟

جواب: اسلامی علماء اور مفسرین نے "سات آسمانوں[1]" کے بارے میں (جن کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ ہوا ہے) کچھ توضیحات بیان کی ہیں۔

① یہاں سات سے مراد تکثیر (زیادہ ہونا) ہے یعنی اس نے متعدد آسمان یعنی بہت سے کرات پیدا کیے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عربی، فارسی، اردو یا دوسری زبانوں میں اعداد کا ذکر کثرت کے معنوں میں کیا جاتا ہے یعنی ایک عدد بولا جاتا ہے لیکن اس سے کوئی معیّن مقدار مراد نہیں ہوتی بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز زیادہ ہے مثلاً عموماً یوں ہوتا ہے کہ ہم اردو میں کہتے ہیں کہ میں نے تمہیں پچاس دفعہ یہ بات کہی ہے یا میں نے اس سے دس مرتبہ مطالبہ کیا

---

[1] سورۂ اعراف - آیت ۵۴

ہے حالانکہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ فعل پچاس یا دس مرتبہ انجام پایا ہو بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ میں نے متعدد بار یہ بات کہی ہے یا اس چیز کا مطالبہ کیا ہے۔

قرآن مجید خدا کے کلمات اور معلومات کے بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (سورۂ لقمان آیت ۲۷)

یعنی اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں اور ان میں سات سمندروں کا اضافہ ہو جاتے (اور وہ خدا کے کلمات اور معلومات لکھیں) تب بھی خدا کے کلمات تمام نہیں ہونگے۔

ظاہر ہے کہ یہاں سات کے عدد سے کثرت اور زیادتی مراد ہے ورنہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اگر ان میں دس یا سو سمندروں کا اضافہ بھی کر دیا جائے تب بھی خدا کی بے پایاں معلومات احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں کیونکہ بنیادی طور پر خدا کی ذات ہر لحاظ سے لامتناہی ہے۔

اسی طرح کئی دوسرے اعداد مثلاً سبعین (۷۰) وغیرہ بھی قرآن مجید یا دوسرے عرب کلمات اور دوسری زبانوں میں کثرت کے معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں اور ان اعداد کا مفہوم کوئی خاص تعداد نہیں ہوتی بلکہ کسی چیز کے زیادہ ہونے کی جانب اشارہ کرنا ہوتا ہے۔

(۲) سات آسمانوں سے مراد وہ سیارے تھے جن کا نزولِ قرآن کے وقت اس زمانے کے لوگوں کو علم تھا یا وہ سیارے ہیں جنہیں دورِ حاضر میں عام لوگ آلات کی مدد کے بغیر دیکھ سکتے ہیں۔

(۳) سات آسمانوں سے مراد گوناگوں ہواؤں اور گیسوں کے مختلف طبقات ہیں جو زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

(۴) تاہم بعض عظیم دانشوروں کے نظریے کے مطابق وہ کواکب، ستارے اور کہکشائیں جو نظر آتی ہیں، سب پہلے آسمان کا جزو ہیں اور اس کے ماورا چھ اور

بڑے جہان ہیں اور سات آسمانوں سے قرآن مجید کی مراد وہ سب کے سب سات عوالم ہیں جو جہان ہستی میں وجود رکھتے ہیں۔ گو انسان کے عصر حاضر کے علم و دانش نے ان میں سے فقط ایک کے چہرے پر سے پردہ اٹھایا ہے تاہم یہ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں انسانی علم کی تکمیل کے نتیجے میں موجودہ جہان محسوس کی پشت پر چھ اور عظیم عوالم کا انکشاف ہو جائے۔ اس نظریے کے طرفدار مندرجہ ذیل آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

"اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ نِ الْکَوَاکِبِ" (سورۂ صافات آیت ٦)

یعنی ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے ذریعے زینت بخشی۔

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ تمام ستارے پہلے آسمان میں ہیں (یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عربی لغت میں کلمۂ "دنیا" کے معنی 'نچلا' اور 'نزدیک' کے ہیں)۔

بہر حال اس نکتے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن آیات اور روایات میں آسمانوں کی تعداد سات بتائی گئی ہے، ان سے کسی طور بھی بطلیموس کے نظریۂ ہیئت کی تائید نہیں ہوتی جس میں اس نے آسمانوں کو پیاز کے چھلکے کے طبقات کی مانند افلاک کی شکل میں پیش کیا ہے (کیونکہ بطلیموس کی فلکیات کے مطابق افلاک اور آسمانوں کی تعداد نو ہے)۔

جہاں تک "سات زمینوں" کا تعلق ہے (جن کا ذکر قرآن مجید میں بطور اشارہ اور بعض احادیث میں بالصراحت کیا گیا ہے) ان کے بارے میں مندرجہ بالا خیالات سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے مثلاً یہ کہ سات کا عدد کثرت کے معنی میں ہے یا یہ کہ سات زمینوں سے مراد سات سیارے (عطارد، زہرہ، زحل، زمین، مریخ، مشتری اور چاند) ہیں یعنی نظام شمسی کے وہی کرات جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں (بلاشبہ نظام شمسی میں کئی ایک اور کرات اور چاند بھی ہیں لیکن وہ عام آنکھ سے نہیں دیکھے جا سکتے) اور اس تشریح کی بنا پر سات آسمانوں سے وہی فضا مراد ہے جو ان سات کرات میں سے ہر ایک پر موجود ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ سات کرات خود زمین شمار ہوتے ہیں۔ جن کے اردگرد کی فضا ان کا آسمان ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عربی لغت میں "سماء" ہر اس چیز کے معنوں میں ہے جو اوپر کی جانب قرار رکھتی ہو۔

یہ تھا خلاصہ ان مختلف تفاسیر کا جو ہمارے علماء اور مفسرین نے سات آسمانوں اور زمینوں کے بارے میں پیش کی ہیں اور بالخصوص آخری تفسیر جو باقی سب کے مقابلے میں زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے اور ان تفاسیر کے شواہد کا ذکر بیشتر تشریح کا محتاج ہے۔

دو مشرق اور دو مغرب کہاں ہیں ؟

سوال: آیت شریفہ "رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ" (سورۂ رحمٰن آیت ۱۷)
یعنی وہ دو مشرق اور دو مغرب کا پروردگار ہے کا کیا مفہوم ہے ؟
جواب: قرآن مجید میں مشرق اور مغرب کا ذکر تثنیہ کی شکل میں بھی کیا گیا ہے
(یعنی دو مشرق اور دو مغرب) اور جمع کی شکل میں بھی مثلاً:
فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ (سورۂ معارج آیت ۴۰)
"مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم" اور ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:
وَأَوْرَثْنَا الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا
(سورۂ اعراف آیت ۱۳۷)

ہم نے زمین ان افراد (یعنی جمعیت بنی اسرائیل) کے اختیار میں دے
دی جو ضعیف اور ناتوان ہو چکے تھے۔
اس بنا پر 'مشرق' اور 'مغرب' کے الفاظ جمع کی شکل میں بھی استعمال ہوئے ہیں
جو متعدد ارکان پر دلالت کرتی ہے اور تثنیہ کی شکل میں بھی جو دو ارکان کی طرف اشارہ کرتی ہے:

مفسرین نے تفسیر میں ان آیات کے دو معنی بتائے ہیں:

پہلے معنی یہ ہیں کہ دو مشرق اور دو مغرب سے مراد زمین کے دو نیم کروں (یعنی شمالی اور جنوبی دو نیم کروں یا مشرقی اور مغربی دو نیم کروں) کے مشرق اور مغرب ہیں۔ حتیٰ کہ بعض نے اس آیت کو ایک نیم کرہ (یعنی براعظم امریکہ) کے دریافت ہونے سے پہلے اس کے وجود کی جانب ایک اشارہ قرار دیا ہے جو بالفعل ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے اسی طرح مشارق اور مغارب سے مراد کرہ زمین کے مختلف نقاط ہیں جن میں سے ہر نقطہ ایک نقطے کی نسبت سے مشرق اور دوسرے نقطے کی نسبت سے مغرب ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں "کرہ" کی خاصیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا ہر نقطہ اس نقطے کی نسبت سے جو اس کے مغرب میں واقع ہو مشرق شمار ہوتا ہے اور سامنے والے نقطے کی نسبت سے مغرب ہوتا ہے لہٰذا بعض لوگ ایسی آیات کو زمین کے مدور ہونے کی جانب اشارہ سمجھتے ہیں۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ مشرق اور مغرب کے متعدد ہونے سے مراد سورج کے حقیقی طلوع اور غروب کے نقطوں کا متعدد ہونا ہے کیونکہ سورج کبھی بھی دو دن ایک ہی نقطے سے طلوع اور ایک ہی نقطے پر غروب نہیں ہوتا اور سورج کے شمال اور جنوب کی جانب جھکاؤ کی وجہ سے (جو زمین کے سورج کے گرد گھومنے کے مدار کی سطح کی نسبت سے اس کے محور کے جھکاؤ کا نتیجہ ہے) سورج ہر روز ایک نقطے سے طلوع ہوتا ہے اور دوسرے نقطے پر غروب ہوتا ہے لہٰذا جب ہم ان مشرقوں اور مغربوں کے مجموعے کو مدنظر رکھیں تو ہمیں چاہیے کہ انہیں مشارق اور مغارب سے تعبیر کریں اور جب ہم فقط سورج کے بڑے شمالی جھکاؤ کے آخری نقطے (ابتدائے گرما) اور بڑے جنوبی جھکاؤ کے آخری نقطے (ابتدائے سرما) کو مدنظر رکھیں تو ہمیں چاہیے کہ انہیں مشرقین اور مغربین سے تعبیر کریں۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ وہ مختصر سی عبارات میں لوگوں کو تخلیق کے حیرت انگیز اسرار کی جانب متوجہ کرتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کے طلوع اور غروب میں تغیر و تبدل کا سبزے، پھولوں اور جیووں

کی پرورش پر اور بالعموم زندہ موجودات کی عام حالت پر اور جہانِ آفرینش کی زیبائش
پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

زمین کا کُروی ہونا اور قرآنِ مجید

سوال: کیا قرآنِ مجید اور روایات میں زمین کے کُروی ہونے کے بارے میں شہادتیں موجود ہیں؟

جواب: قرآن مجید میں جن اسرارِ ہستی کی جانب اشارہ ہوا ہے ان میں سے ایک زمین کے کروی ہونے کا موضوع بھی ہے اور اس حقیقت کا مندرجہ ذیل آیات سے پتا چلتا ہے:

① وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا (سورۂ اعراف آیت ۱۳۷)

"ہم نے اس قوم کو جو مستضعف شمار کی جاتی تھی زمین کے مشرقوں اور مغربوں کا وارث قرار دیا۔"

② رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (سورۂ صافات آیت ۷)

"آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا خدا

اور مشرقوں کا خدا۔"

(۳) فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ

(سورۂ معارج آیت ۴۰)

مشرقوں اور مغربوں کے خدا کی قسم ہم قادر اور توانا ہیں۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ جیسا کہ گزشتہ بحث میں اشارہ ہوا ہے یہ آیات مشرقوں اور مغربوں اور سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے نقطوں کے تعدد پر دلالت کرتی ہیں جس کے لیے زمین کا گردی ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اگر زمین مسطح اور ہموار ہوتی تو دنیا کا صرف ایک مشرق اور ایک مغرب ہوتا اور صرف زمین کے گردی ہونے کی صورت میں اس کی خمیدگی کی نسبت سے ہر نقطے کا ایک خاص مشرق اور ایک جداگانہ مغرب ہو سکتا ہے۔

اور سورج کے زمین کے مختلف حصوں میں سے ایک حصے پر طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے کسی دوسرے حصے میں غروب ہونا لازمی ہے لہٰذا مشرق اور مغرب کا متعدد ہونا زمین کے گردی ہونے کی واضح دلیل ہے۔

زمین کے گردی ہونے کے بارے میں روایات

جو روایات ائمہ معصومینؑ سے ہم تک پہنچی ہیں ان سے زمین کا گردی ہونا بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ ان میں سے ایک روایت امام صادقؑ سے نقل کی گئی ہے جس کا مضمون حسب ذیل ہے:

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: ایک سفر میں ایک شخص میرا ہم سفر ہو گیا وہ اس بات کا پابند تھا کہ مغرب کی نماز رات کی تاریکی میں اور صبح کی نماز کامل تاریکی میں (آخر شب) پڑھے۔ لیکن میں اس کے برخلاف تھا۔ جس وقت سورج غروب ہوتا میں مغرب کی نماز پڑھتا اور جب فجر طلوع ہوتی تو صبح کی نماز بجا لاتا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں بھی اس کی روش اختیار کروں اور اپنے عمل کی یوں وضاحت کی: سورج ہماری

سرزمین پر طلوع ہونے سے پہلے دوسرے مقامات پر طلوع ہوتا ہے اور جب ہماری سرزمین سے اوجھل ہو جاتا ہے تب بھی دوسرے مقامات پر روشن ہوتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا:

ہمارا وظیفہ یہ ہے کہ جب سورج ہمارے افق سے اوجھل ہو جائے تو مغرب کی نماز پڑھ لیں اور یہ ضروری نہیں کہ اس کے دوسرے مقامات پر غروب ہونے کا انتظار کریں اور جب فجر طلوع کرے تو ہمیں صبح کی نماز پڑھنی چاہیے خواہ اس وقت سورج دوسرے مقامات پر نکلا ہوا ہو کیونکہ تمام مقامات کے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنی نمازیں اپنے افق میں طلوعِ فجر اور غروبِ آفتاب کے مطابق ادا کریں۔[1]

امام علیہ السلام نے یہ حقیقت ایک اور حدیث میں یوں بیان فرمائی ہے:

"اِنَّمَا عَلَيْكَ مَشْرِقُكَ وَمَغْرِبُكَ"

یعنی تجھے چاہیے کہ اپنے منطقے کے مشرق اور مغرب کو اپنے عمل کی بنیاد قرار دے۔

اور یہ سب کچھ زمین کے کروی ہونے کی بنا پر فرمایا گیا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱ صفحہ ۲۳۷

زمین کی وضعی حرکت

سوال: کیا یہ موضوع جس پر ہیئت دان اور ماہرین فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ زمین کی شکل کُروی ہے اور اپنے محور پر گردش بھی کرتی ہے سائنسی نقطہ نظر سے مسلّم ہے یا ابھی مفروضے کی شکل میں ہے ؟

اور اگر زمین واقعی گردش میں ہے تو اس کی علمی اور حسی نشانیاں کیا ہیں؟

اس کی کیا وجہ ہے کہ قطبی ستارہ (ستارۂ جدی) جس کے ذریعے قبلہ کی سمت متعین کی جاتی ہے ہمیشہ ایک مقام پر دکھائی دیتا ہے ؟

علاوہ ازیں قرآن مجید اور اسلامی روایات میں اس موضوع کی تائید میں کوئی مواد ملتا ہے یا نہیں ؟

جواب: موجودہ دور میں زمین کے " کروی ہونے " اور " حرکت کرنے " کو مسلمہ سائنسی مسائل میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کے لیے مختلف دلائل دیے گئے ہیں۔ زمین کی حرکت کی واضح ترین دلیل " پنڈولم کی دلیل " ہے ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وزنی چیز کو ایک رسی کے ذریعے بلند مقام

پر یوں لٹکا دیا جاتا ہے کہ پوری آزادی کے ساتھ حرکت کر سکے۔ جب اس چیز کو حرکت میں لایا جاتا ہے تو وہ کافی دیر تک اپنی حرکت جاری رکھتی ہے۔ اب اگر زمین ساکت اور بے حرکت ہو تو ضروری ہے کہ مذکورہ چیز کی آمد و رفت ایک معینہ خط تک محدود ہو لیکن تجربے سے پتا چلتا ہے کہ اس چیز کی حرکت ایک معینہ خط پر نہیں ہوتی اور وہ بتدریج پہلے خط سے زیادہ دور ہٹتی چلی جاتی ہے۔

اس تجربے سے پتا چلتا ہے کہ زمین ہمیشہ ایک معین سمت سے دوسری سمت کی جانب حرکت کرتی ہے۔ حرکت کی اس سمت کو جو مغرب سے مشرق کی جانب ہوتی ہے انہیں خطوط کی رُو سے متعین کیا جا سکتا ہے (اس دلیل کی بیشتر توضیح کے لیے علم ہیئت کی کتابوں میں موجود مختلف تصاویر سے استفادہ کریں)۔ اسی طرح تجربے سے پتا چلتا ہے کہ اگر ایک پتھر کو ایک بلند مقام پر سے آہستہ سے چھوڑ دیا جائے تو وہ زمین پر بالکل سیدھے خط میں نہیں گرتا بلکہ تھوڑا سا مغرب کی جانب گرتا ہے اور یہ خود اس بات کی نشانی ہے کہ زمین مغرب سے مشرق کی طرف گھومتی ہے۔

البتہ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قطبی ستارہ ہمیشہ ایک مقام پر ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ستارہ (تقریباً) زمین کے محور کے بالمقابل واقع ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی کُرے کو اس کے محور پر گھمایا جائے (مثلاً ایک سوئی کو ایک سیب کے وسط میں سے گزار کر سیب کو اس سوئی کے گرد گھمایا جائے) تو نقطۂ محور ہمیشہ ایک ہی رہے گا مثلاً سوئی کا سرا ہمیشہ ایک جگہ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قطبی ستارہ ہمیشہ ایک جگہ نظر آتا ہے۔

البتہ جہاں تک زمین کی وضع کا تعلق ہے ہمیں اپنے سامنے والے نقطے (زمین کے نیچے والے حصے) کی جانب توجہ دینی چاہیے چونکہ زمین کی شکل تقریباً ایک کُرے کی ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی جائیں اس کی وضع یکساں دیکھیں گے یعنی اپنے سر کے اوپر والے نقطے کو آسمان اور پاؤں کے نیچے والے نقطے کو زمین ہی پائیں گے اور کششِ ثقل ہمیں ہر جگہ زمین پر قائم رکھتی ہے۔

البتہ بہت سے ستارے ایسے ہیں جو زمین کے جنوبی نیم کرے میں نظر آتے ہیں اور شمالی نیم کرے میں نہیں دیکھے جا سکتے اور اس کے برعکس سیارے کبھی کبھی زمین کے ایک نقطے سے اور کبھی دوسرے نقطے سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ کرۂ زمین کے اس منطقے کی وضع جو ہمارے مقابل ہے بالکل اس منطقے کی مانند ہے جس پر ہم رہتے ہیں۔

ذیل میں ان آیات اور روایات کے نمونے دیے جاتے ہیں جو زمین کے حرکت کرنے کے نظریے کی تائید کرتی ہیں:

(۱) وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ (سورۂ نمل آیت ۸۸)

یعنی تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور تصور کرتا ہے کہ یہ جامد ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح رواں دواں ہیں۔ یہ خدا کی قوتِ تخلیق ہے جس نے آفرینش کی ہر چیز کو استوار کیا ہے۔

بعض اوقات یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس آیت کا تعلق حالاتِ قیامت سے ہے یعنی انسان قیامت کے دن پہاڑوں کو اس حالت میں دیکھے گا لیکن جملہ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ اس خیال کی نفی کرتا ہے کیونکہ یہ عبارت روز قیامت سے ہم آہنگ نہیں اور قیامت کا دن آفرینش کے استوار ہونے کا دن نہیں بلکہ نظام شمسی کے دگرگوں ہو جانے کا دن ہے اور آیت کے آخر میں خدا کا واضح الفاظ میں اپنی تخلیق کے استحکام کا ذکر کرنا انقلاب کے دور سے نہیں بلکہ نظام کی برقراری کے دور سے مناسبت رکھتا ہے۔

آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پہاڑ حرکت میں ہیں گو وہ ہمیں ساکن اور بے حرکت دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ خدا نے زمین کی حرکت کی بجائے پہاڑوں کی حرکت کا ذکر کیوں کیا ہے جبکہ پہاڑوں کی حرکت زمین کی حرکت کے تابع ہے اور کیا یہ زیادہ مناسب نہ ہوتا کہ پہاڑوں کی حرکت کی بجائے زمین کی

حرکت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تاہم اس سوال کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی کروی چیز اپنے محور پر گھومتی ہے تو اس کی گردش کا اظہار ان دندانوں، نقوش اور رنگوں کے ذریعے ہوتا ہے جو اس پر مرتسم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پہاڑ کا نام اس لیے بھی لیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ سے عظمت اور بزرگی کا مظہر رہا ہے اور یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ زمین کی حرکت کے بغیر پہاڑوں کی حرکت کوئی معنی اور مفہوم نہیں رکھتی۔

ایک غور طلب نکتہ یہ ہے کہ "سکون" کی بجائے "جمود" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ لفظ اس سیاق و سباق میں زیادہ موجب اظہار ہے اور زمین کے ساکن ہونے کے خیال کے بیان کے لیے (جس کے بارے میں انسان وہم میں مبتلا ہوتا ہے) زیادہ واضح ہے۔

قرآن کے پہاڑوں کی حرکت کو بادلوں کی حرکت سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ زمین کی حرکت بادلوں کی حرکت کی طرح خاموش، نرم اور ہموار ہونے کے ساتھ ساتھ تیز بھی ہے۔

(۲) اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا[1] (سورۂ طٰہٰ آیت ۵۳)

قرآن مجید ہماری زمین کو گہوارے سے تشبیہ دیتا ہے اور ممکن ہے کہ اس تشبیہ کی ایک یہ بھی وجہ ہو کہ جس طرح گہوارا ہموار اور نرم دورانی حرکت کرتا ہے وہی کیفیت زمین کی حرکت کی بھی ہے۔

---

[1] وہ خدا جس نے زمین کو تمہارے لیے گہوارا بنایا۔

اس آیت کی تفسیر کیا ہے؟

سوال: آیت شریفہ فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ سے کیا مقصود ہے؟
جواب: لغت میں "خُنَّسِ" سے مراد رجوع کرنے والا اور بازگشت کرنے والا ہے "کُنَّسِ" کے معنی پنہاں ہونے والا کے ہیں اور "جَوَارِ" جاری کی جمع ہے اور اس کے معنی چلنے والے کے ہیں۔
جیسے کہ اس سے پہلے اور بعد کی آیات گواہی دیتی ہیں اور مفسرین بھی اسکی تائید کرتے ہیں۔ ان آیات سے مراد وہ سیارے ہیں جو آنکھ سے دیکھے جاسکتے ہیں (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل) کیونکہ یہ حرکت میں ہیں اور کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی غروب ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید ان ستاروں کا ذکر قسم کے ساتھ کرکے لوگوں کی توجہ ان کی مخصوص اور استثنائی وضع اور ان کی حرکات اور گردش اور خالق کائنات کی عظمت کی جانب مبذول کراتا ہے یعنی ان بازگشت کرنے والے ستاروں کی قسم جو چلنے والے

لہ سورۂ تکویر۔ آیت ۱۵۔ ۱۶

ہیں اور چھپ جانے والے ہیں۔

یہ اہم نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ماہرین فلکیات نے ان ستاروں کو "نجوم متحیرہ" کا نام دیا ہے کیونکہ ان کی حرکات خط مستقیم پر نہیں ہوتیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ مدت سفر کرتے ہیں پھر تھوڑا سا واپس لوٹتے ہیں اور دوبارہ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اس کے اسباب کے بارے میں فلکیات کی کتابوں میں کافی بحث کی گئی ہے اور ممکن ہے کہ مندرجہ بالا آیات (جنہوں نے ان ستاروں کا ذکر چلنے والوں اور واپس آنے والوں کے طور پر کیا ہے) کا اشارہ ان ستاروں کے متلون سفر کے راستے کی جانب ہو (بلاشبہ اس متلون سفر کا راستہ ظاہری پہلو رکھتا ہے جو ہمارے مشاہدے میں ہے)۔ بہر حال یہ وہی "سیار" ستارے ہیں جن کی مخصوص وضع انہیں ثوابت سے ممیّز کرتی ہے۔

شب قدر کی کیا اہمیت ہے ؟

سوال : دین اسلام میں شب قدر کی اہمیت اور عظمت کے بارے میں بہت سے مطالب بیان کیے گئے ہیں اور دینی پیشواؤں کی جانب سے اس رات کے لیے جو مشہور روایات کے مطابق ماہِ رمضان المبارک کی انیسویں، اکیسویں یا تیئیسویں راتوں میں سے ایک رات ہوتی ہے ہمیں خاص عبادات بجالانے کی ہدایات ملی ہیں۔
معلوم ہوتا ہے کہ تمام سال میں "شب قدر" ایک رات سے زیادہ نہیں ہے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ افق کے تفاوت کی وجہ سے ماہ رمضان کا آغاز بعض ممالک میں ایک دو دن پہلے اور بعض میں ایک دو دن بعد ہوتا ہے۔ اس حساب کی رُو سے ان مقامات پر شب قدر کا ایک یا دو راتوں کا باہمی اختلاف ہو جاتا ہے اور ان مختلف مقامات کے لیے متعدد شب ہائے قدر وجود میں آجاتی ہیں۔ یہ صورتِ حال شب قدر کے تمام سال میں صرف ایک رات ہونے اور مخصوص رات میں ملائکہ کے

خدا کی رحمت کے ساتھ نازل ہونے سے کیونکر ہم آہنگ ہے؟ اور یا یہ صورت ہے کہ شب قدر رسول اکرمؐ کے زمانے اور مکہ کے علاقے سے مخصوص تھی اور بعد کے ادوار میں اس رات کا کوئی وجود نہیں؟

جواب: دینی مدارک کی رو سے یہ بات بالکل ثابت ہے کہ شب قدر رسولِ اکرمؐ کے زمانے اور خطۂ حجاز کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ تمام ادوار میں اور مختلف مقامات کے لیے اپنی پوری عظمت اور اہمیت کے ساتھ موجود رہی ہے اور اس بارے میں بحث اور گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں۔

مذکورہ بالا اعتراض اس وجہ سے پیش آیا ہے کہ یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ تمام سال میں ایک شب قدر ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہر سال دنیا کے تمام مقامات کے لیے ایک واحد اور مشترک رات بطور شب قدر متعین کی گئی ہے اور یہ رات تمام کرۂ زمین میں ایک مقررہ وقت پر شروع ہوتی ہے اور ایک مقررہ وقت پر ہی اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

حالانکہ یہ تصور غلط ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ زمین کروی ہے اور ہمیشہ اس کا ایک نیم کرہ تاریکی میں اور دوسرا نیم کرہ روشنی میں ہوتا ہے لہٰذا ساری کی ساری زمین میں ایک معین اور مشترک وقت پر رات ہونے کا ہرگز کوئی امکان نہیں۔ یہ کہنے سے کہ "سارے سال میں ایک رات شب قدر ہوتی ہے" مراد یہ ہے کہ تمام مقامات کے باشندوں کے لیے ان کے اپنے قمری سال کے مطابق فقط ایک ایسی رات وجود رکھتی ہے جو شب قدر ہوتی ہے۔ اس قول کی توضیح یہ ہے کہ ہر مقام کے رہنے والے اپنا قمری سال اس مقام کے خاص افق کے مطابق ماہ محرم کی پہلی تاریخ سے شروع کرتے ہیں اور چند قمری مہینے گزرنے کے بعد اس مقام کا ماہ رمضان بھی وہاں کے خاص افق کے مطابق شروع ہوتا ہے اور اس مہینے میں انیسویں، اکیسویں یا تیئیسویں رات وہاں کے رہنے والوں کے لیے شب قدر ہوتی ہے۔

یہ بات کہ ہر مقام کے باشندوں کو اپنے مقدس ایام اور اوقات کا تعین اس مقام

کے خاص افق سے کرنا چاہیے۔ فقط شبِ قدر سے ہی مخصوص نہیں بلکہ دوسرے مقدس اسلامی ایام اور اوقات کا تعین بھی اسی طرح کیا جاتا ہے مثلاً عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن اسلام میں مقدس دن ہیں اور ان کے لیے خاص عبادات کا حکم دیا گیا ہے اور ان عیدوں میں سے کوئی بھی سال بھر میں ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ مختلف اسلامی ممالک میں اس ایک دن کا تعین ان میں موجود افقی تفاوت کے باوجود ہر ملک کے خاص افق کو مدِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثلاً سعودی عرب میں عیدِ قربان اکثر پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ایک یا دو دن پہلے منائی جاتی ہے۔

یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ شب قدر کے بارے میں یہ حساب بعض دوسرے مطالب (مثلاً یہ کہ اس رات میں فرشتے نازل ہوتے ہیں) کے منافی نہیں کیونکہ یہ تمام حالات جو اس رات میں خدا کی خاص رحمت کی توسیع کا مظہر ہیں ہر مقام کے باشندوں کے لیے اس مقام کی خاص شب قدر میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

ذوالقرنین نے کیسے دیکھا کہ سورج تاریک پانی میں ڈوبتا ہے

سوال: قرآن مجید سورۂ کہف کی ۸۶ ویں آیت میں ذوالقرنین کی داستان کے سلسلے میں فرماتا ہے:

مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ

جب وہ سورج غروب ہونے کی جگہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سورج تاریک پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اس تاریک پانی سے کیا مراد ہے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ سورج اپنی تمام عظمت کے باوجود تاریک پانی میں ڈوب جائے؟ اور کیا یہ معنی زمین کی کرویت اور اس کے سورج کے گرد گھومنے اور جدید فلکیات کے مندرجات کے خلاف نہیں ہیں؟

جواب: ان آخری تحقیقات کے مطابق جو کہ اسلامی علماء اور عالی قدر مفسرین قرآن نے ذوالقرنین کی داستان کے بارے میں کی ہیں مندرجہ بالا آیت کے معنی یہ ہیں:

ذوالقرنین نے مغرب کی جانب اپنی پیش قدمی اسی طرح جاری رکھی حتیٰ کہ

وہ سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔

مفسرین کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا سمندر سے مراد بحر اوقیانوس ہے یا بحیرۂ روم اور آیا ذوالقرنین کی پیش قدمی کی آخری حد مغرب میں مراکش کے علاقے تک تھی یا ترکی میں ازمیر تک۔ بہرحال وہ غروب آفتاب کا وقت تھا جب ذوالقرنین سمندر کے کنارے کھڑا ہو کر اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ رہا تھا کیونکہ جب کوئی شخص سمندر کے ساحل پر کھڑا ہوتا ہے تو زمین کے کروی ہونے کی بنا پر سورج ڈوبنے کے وقت اسے یوں دکھائی دیتا ہے کہ سورج آہستہ آہستہ افق کے آخری سرے پر سمندر میں ڈوب رہا ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید بھی ذوالقرنین کی حالت اور احساس کو یوں بیان کرتا ہے:

اس نے یوں محسوس کیا کہ جیسے سورج تاریک پانی میں ڈوب رہا ہے۔

اس لحاظ سے مذکورہ بالا آیت زمین کے کروی ہونے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور "عین حمئۃ" سے مراد وہی سمندر ہے جس کے افق کے آخری سرے میں سورج غروب ہوتا ہے۔

تاہم یہ ایک الگ سوال ہے کہ قرآن مجید نے سمندر کے پانی کو "عین" سے کیوں تعبیر کیا ہے؟

مفسرین نے اس کی توضیح یوں کی ہے:

لفظ "عین" کے سات معانی میں سے ایک "زیادہ پانی" اور "پانی گرنے کی جگہ" ہے۔ چونکہ سمندروں SEAS اور اوقیانوسوں OCEANS کا پانی زیادہ ہوتا ہے اور ندیاں، نہریں، دریا اور بڑے دریا عموماً ان میں گرتے ہیں اور سمندروں کا پانی بھی اوقیانوسوں کے پانی سے متصل ہوتا ہے لہٰذا قرآن مجید نے اسے زیادہ پانی اور پانی کا ڈیلٹا کے معنوں میں لفظ "عین" سے تعبیر کیا ہے۔

اور جہاں تک اس امر کا سوال ہے کہ قرآن مجید نے سمندر کے پانی کو تاریک پانی سے کیوں تعبیر کیا ہے۔ اس کی چند وجوہات بتائی جاسکتی ہیں:

(۱) ندیوں کے مٹی سے آلودہ پانی کے گرنے اور ساحل کی مٹی اور گادکے زیر اثر سمندر

کے ساحل کا پانی گدلا ہو جاتا ہے اور وہ مٹیالا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

(۲) دراصل جب سورج کے غروب ہونے کے وقت اس کی شعاعیں سمندر کے پانی پر پڑتی ہیں تو سمندر کا پانی تاریک رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اسے گل آلود پانی سے تشبیہ دی ہے۔

(۳) پانی جتنا زیادہ اور گہرا ہو گہرے نیلے رنگ کی شدت کے زیر اثر سیاہ دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ ذوالقرنین نے سمندر کا جو پانی دیکھا وہ زیادہ تھا اور اس نے سیاہی مائل شکل اختیار کر لی تھی اس لیے قرآن مجید اسے سیاہ مٹی سے مخلوط پانی سے تعبیر کرتا ہے۔ [۱]

---

[۱] تفسیر مراغی۔ جزو ۱۶۔ صفحہ ۱۷۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۷۔ صفحہ ۴۹۰۔ تفسیر طنطاوی۔ جزو ۹۔ صفحہ ۲۰۰۔ المنجد۔ ذیل کلمہ حمئۃ و عین، مفردات راغب، قصص قرآن ذیل کلمہ ذوالقرنین۔

قرآن مجید اور آسمانی کرّوں کی تسخیر

سوال: موجودہ دور میں روسی اور امریکی سائنس دان جن آسمانی کرّوں کو تسخیر کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے ہیں کیا قرآن مجید میں ان کا کوئی ذکر آیا ہے یا نہیں اور کیا وہ اس بارے میں مزید کامیابیاں حاصل کریں گے یا نہیں؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے جس دن سے دائرۂ وجود میں قدم رکھا ہے ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے اور اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب وہ ترقی کی جانب قدم نہیں بڑھاتا اور عالم آفرینش کے کسی پوشیدہ راز کا انکشاف نہیں کرتا لہٰذا اس امر میں کوئی چیز مانع نہیں کہ ایک دن ایسا آئے کہ وہ اپنی خداداد قوت اور طاقت سے اپنی زندگی کا دامن آسمانی کرات پر بھی پھیلا دے۔

شاید قرآن مجید کی وہ آیات جو انسان کے زمین اور آسمان کو مسخر کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اس مطلب کی جانب اشارے سے خالی نہ ہوں کیونکہ گو سورج اور

چاند اور جو کچھ آسمانوں میں ہے وہ پہلے دن سے ہی انسان کے لیے مسخر ہو چکا ہے لیکن تسخیر یا اس تسخیر سے فائدہ اٹھانے کے بھی درجات ہیں اور ان میں سب سے کامل درجہ وہ ہے کہ جب یہ اجرام زندگی کا گہوارہ بن جائیں۔ اس سلسلے میں چند آیات درج ذیل ہیں:

① "وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ" (سورہ جاثیہ آیت ۱۳)

اس جہان کے پیدا کرنے والے نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور یہ مطلب سوچ بچار کرنے والوں کے لیے ہدایت اور ایمان کا وسیلہ ہے۔

② أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً ۗ (سورہ لقمان آیت ۳۰)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور اپنی باطنی اور ظاہری نعمتیں تمہارے اختیار میں دے دی ہیں۔

③ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

(سورہ ابراہیم آیت ۳۳)

اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

اور یہ جملہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں وارد ہوا ہے۔

مندرجہ بالا آیات کے مطابق قرآن مجید فرماتا ہے کہ:

جو کچھ زمین میں ہے ہم نے پہلے دن سے تمہارے اختیار میں دے دیا ہے جبکہ انسان نے زیر زمین وسائل پر ایک جگہ اور ایک بار ہی دسترس حاصل نہیں کی بلکہ بتدریج اور ہر زمانے میں کسی نہ کسی حد تک ان خزانوں کے بارے میں علم حاصل کیا ہے اور انہیں کھود نکالا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قرآن مجید فرماتا ہے کہ "جو کچھ زمین میں ہے ہم نے انسان کے اختیار میں دے دیا ہے" تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زمین

کے تمام ذخائر سب بنی نوع انسان کے اختیار میں دے دیئے گئے ہیں کیونکہ ان میں سے بہت سی معدنیات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دریافت ہوئی ہیں اور ہر زمانے میں ایک مخصوص طبقہ زیر زمین ذخائر کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوا ہے بلکہ اس سے مراد تمام کے تمام انسان ہیں کہ جوں جوں وقت گزرتا ہے وجود میں آتے ہیں اگرچہ ان میں سے صرف چند ہوتے ہیں جو معدنیات کا کھوج لگاتے ہیں۔

اور یہ بعید نہیں کہ انسان آئندہ زمین میں سے ایسے نئے وسائل دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتے جن کے بارے میں موجودہ دور میں اسے کوئی علم نہیں ہے۔ اسی بنا پر کیا امر مانع ہے کہ گو سیارے پہلے دن سے ہی انسان کے لیے مسخر کر دیے گئے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان سے بیشتر فائدہ اٹھائے اور آسمانی کروں کو اپنی دسترس میں لے آئے اور ارشاد قرآنی "وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ"[1] کا پورا پورا مصداق بن جائے۔

علاوہ ازیں سورۂ رحمٰن کی ۳۴ ویں آیت سے بھی پتا چلتا ہے کہ انسان موجودہ علمی اور صنعتی مہارت اور امکانات سے فائدہ اٹھا کر فضا میں سفر کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (سورۂ رحمٰن آیت ۳۳)

اے انسانوں اور غیر انسانوں کے گروہ! اگر تم زمین اور آسمان کے خطوں میں سے گزر سکتے ہو تو اس کام کو انجام دو لیکن خصوصی مہارت کے بغیر تم یہ کام نہیں کر سکو گے۔

---

[1] یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مندرجہ بالا جواب چاند کی تسخیر سے پہلے چھاپا گیا تھا اور ابھی سائنسدانوں نے پہلے خلا نورد کو خلا میں نہیں بھیجا تھا۔ اس وقت جو واحد قدم اس راستے میں اٹھایا گیا تھا وہ مصنوعی سیاروں کو فضا میں چھوڑنا تھا۔

کیا یہ آیت دورِ حاضر کے وسائلِ نقلیہ کی جانب اشارہ کرتی ہے ؟

سوال: قرآن مجید کی سورۂ نحل میں خداوند تعالےٰ ان چارپایوں کی تخلیق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جنہیں انسان باربرداری اور سواری کے لیے استعمال کرتا ہے یوں ارشاد فرماتا ہے: "وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ"۔ یعنی وہ ایسی چیزیں پیدا کرے گا جنہیں تم نہیں جانتے۔ کیا ان چیزوں سے دورِ حاضر کے وسایلِ نقل وحمل مراد ہیں ؟

جواب: ہمارے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں دو باتوں کا احتمال ظاہر کیا ہے۔ ایک تو یہی کہ جن چیزوں کو ہم نہیں جانتے ان کی تخلیق سے مراد دورِ حاضر کی سواریاں اور وہ دوسرے وسائلِ نقلیہ ہیں جن کا علم اس زمانے کے لوگوں کو نہیں تھا۔ اس احتمال کی تائید جملہ "لترکبوھا" (تاکہ تم ان پر سواری کرو) سے بھی ہوتی ہے۔

لہ سورۂ نحل آیت ۸

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس آیت سے مراد وہ جاندار اور موجودات ہیں جو جنگلوں میں اور سمندروں کی گہرائیوں میں اور دوسرے دور دراز مقامات پر پیدا کیے گئے ہیں اور اس زمانے میں انسان کی نظر سے اوجھل تھے۔

ان ہر دو احتمالات کی بنا پر یہ آیت قرآن مجید کی اعجاز آمیز آیات میں سے ہے کیونکہ یہ ان موجودات کی خبر دیتی ہے جو اس زمانے کے انسان کی نظر سے پوشیدہ تھے اور بعد میں سائنس کی ترقی کے ساتھ ظاہر ہو گئے۔

کیا یہ آیات انواع کے ارتقا کے نظریے کی تائید کرتی ہیں؟

سوال: حال ہی میں ایک کتاب لکھی گئی ہے جس کے مصنف نے ٹرانسفارم ازم
جاندار موجودات کے ایک نوع سے
دوسری نوع کی جانب تدریجی ارتقا کے نظریے کی صحت کی بہت زیادہ توضیح کرنے کے بعد اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس نظریے کی آیات قرآنی سے تطبیق کرے اور بقول اس کے یہ ثابت کرے کہ قرآن مجید بھی زندہ موجودات کے ایک نوع سے دوسری نوع کی جانب تدریجی ارتقا کے نظریے کی تائید کرتا ہے۔ اپنے خیال کو درست ثابت کرنے کے لیے اس نے مندرجہ ذیل دو آیات سے استدلال کیا ہے:

(۱) اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْئًا (سورۂ مریم آیت ۶۷)
کیا انسان اس بات کو یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اسے جب کہ پہلے پیدا کیا وہ کچھ بھی نہ تھا؟
کتاب کے مصنف نے کلمہ "مِنْ قَبْلُ اور لَمْ یَكُ شَیْئًا"

اس کمال کے مرتبے پر پہنچنے سے پہلے آدمی کوئی چیز نہ تھا لیکن حیوانات کی مختلف یعنی واحد خلیے والے جانداروں سے لے کر انسان نما بندروں تک کی شکلوں میں زندگی بسر کرتا تھا نیز یہ کہ اس میں موجودہ انسانی کمالات کی کوئی جسمانی یا نفسیاتی نشانی موجود نہ تھی۔

(۲) هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝

(سورۂ دھر۔ آیت ۱)

کیا انسان اس حقیقت کا ادراک نہیں کرتا کہ اس پر ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟

کتاب کے مصنف نے یہاں بھی کلمہ "لم یکن شیئاً مذکوراً" سے استنباط کیا ہے کہ:
اس سے پیشتر کہ انسان اس امر کی قابلیت پیدا کرے کہ اس کے نام کا آسمانی کتابوں میں ذکر کیا جائے وہ کوئی چیز نہ تھا۔ انتہا یہ ہے کہ انسانی کمال نہ رکھنے اور حیوانات کے حلقے میں ہونے کی وجہ سے وہ اس بات کی قابلیت نہیں رکھتا تھا کہ اس کا نام اور اس کے حال کی شرح آسمانی کتابوں (صحف ابراہیمؑ۔ تورات۔ انجیل اور قرآن) میں بیان کیا جائے۔

کیا واقعی مندرجہ بالا آیات انسان کے ایک نوع سے دوسری نوع کی جانب تدریجی ارتقاء پر دلالت کرتی ہیں اور اگر یہ ٹرانسفارم ازم کے نظریے سے مربوط نہیں ہیں تو پھر ان آیات کا مطلب کیا ہے؟

جواب: ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق مندرجہ بالا آیات کا ٹرانسفارم ازم اور جانداروں کے تدریجی ارتقاء سے کوئی تعلق نہیں۔ ان آیات کے اور معنی ہیں جن کی توضیح ذیل میں کی جاتی ہے:

پہلی آیت کی تفسیر

جن مسائل کا باور کرنا انسان کے لیے مشکل ہوتا ہے اور وہ آسانی سے اپنے آپ کو ان کے بارے میں مطمئن نہیں کرسکتا ان میں سے ایک "معاد" یعنی لوگوں کا ایک دوسرے مقام پر زندہ ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات "معاد" کے منکرین

کے انکار کی حالت بیان کرنے اور اس کے بارے میں ان کا شک رفع کرنے کی غرض سے نازل ہوئی ہیں۔ سورۂ مریم کی ۶۶ ویں، ۶۷ ویں اور ۶۸ ویں آیات بھی انہیں میں سے ہیں۔

ان آیات میں خداوند تعالیٰ قیامت کے منکرین کے انکار کی کیفیت اور اس کا جواب یوں ارشاد فرماتا ہے:

"وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ"

یعنی قیامت کے منکرین کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں تو پھر دوبارہ زندہ ہو جائیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ ہم نے انہیں اس سے پہلے جب وہ کچھ بھی نہ تھے پیدا کیا۔ تو (اے رسولؐ!) تمہارے پروردگار کی قسم ہم انہیں اور شیطانوں کو محشور کریں گے۔"

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا آیت "أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا" جس پر مذکورہ کتاب کے مصنف نے اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے ان لوگوں کے جواب میں ہے جو کہتے ہیں کہ آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان موت کے بعد جب کہ اس کے بدن کے ذرات ایک دوسرے سے جدا ہو کر بکھر چکے ہوں دوبارہ زندہ ہو جائے اور اپنی پہلی حالت پر آ جائے؟ کیا وہ لوگ اپنی تخلیق کی ابتدا کو بھلا چکے ہیں کیا وہ نہیں جانتے کہ ہم انہیں عدم سے وجود میں لائے؟ "ولم یک شیئاً"؟

جو لوگ جانتے ہیں کہ ہم یہ قدرت رکھتے ہیں وہ مُردوں کا دوبارہ زندہ کرنا ہم سے کیوں بعید سمجھتے ہیں جب کہ ان کا ابتدائی خمیر "مادہ اور توانائی کی بقا" کے قانون کے مطابق کبھی فنا نہیں ہوتا اور ہمیشہ باقی رہتا ہے جو خدا انسان کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہو کیا وہ اس کے پراگندہ اجزاء کو جمع نہیں کر سکتا؟

لہٰذا مندرجہ بالا آیات کا یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا کہ انسان کمال کے اس درجے تک پہنچنے سے پہلے گوناگوں صورتوں میں جاندار موجودات کے زمرے میں رہا ہے

بلکہ یہ آیت کئی دوسری آیات کی مانند ہے جو قیامت کے اثبات کے بارے میں اور منکرین کے جواب میں وارد ہوئی ہیں۔

دوسری آیت کی تفسیر

جب کوئی نومولود بچہ بے حد سرد موسم میں کسی حادثے کے نتیجے میں والدین سے جدا ہو جائے تو قدرتی طور پر وہ بچہ جلد ہی ہلاک ہو جائے گا۔ اب اگر کوئی نیک شخص موقع پر پہنچ جائے اور اسے اپنے گھر لے جائے اور ایک مہربان باپ کی طرح اس کی دیکھ بھال کرے اور وہ بچہ اس کی محبت سے بہرہ مند ہو اور اس کے خوان نعمت سے پوری طرح لطف اندوز ہو تو وہ کل کا بے سروسامان بچہ آج اپنے آپ کو ایسے مرحلے پر پائے گا کہ وہ بظاہر ہر قسم کے لوازم زندگی کا مالک ہوگا اور دوسروں سے بے نیاز ہوگا۔

بسا اوقات ایسا ہونا بھی ممکن ہے کہ غرور اور خودغرضی اس نیک شخص کی سابقہ محبت کی یاد اس لڑکے کے دل سے محو کر دے اور وہ اپنے وقتی منافع کی خاطر اس سے لڑائی جھگڑا کرے اور احسان فراموشی کا مرتکب ہو۔ اس صورت میں اس نیک شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس لڑکے کو اس کی بے بسی اور کسمپرسی کا زمانہ یاد دلائے اور اس کے ناشکرے پن اور احسان ناشناسی پر اسے لعنت ملامت کرے۔

خداوند تعالےٰ نے بھی سورۂ دہر کے شروع میں ان سرکش اور طاغی افراد کی تنبیہ کے لیے جنہوں نے اپنی تخلیق کی ابتدا کو بھلا کر احسان ناشناسی اور ناشکری کا راستا اختیار کیا ہے یہی انداز اختیار کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ "کیا آدم کے جو فرزند اب سرکش اور خودسر ہو گئے ہیں، ان پر ایک ایسا وقت نہیں گزرا جب وہ بالکل ہیچ اور نیست و نابود تھے اور ان کا قطعاً کوئی وجود نہ تھا۔" ولم یکن شیئاً مذکوراً" لیکن ہم نے ارادہ کیا کہ انہیں نیستی سے ہستی میں لا کر ان کے بدن پر انسانیت کا لباس اوڑھا دیں؟" کیا انہوں نے یہ نعمتیں اور احسانات بھلا کر سرکشی اور کفران نعمت کا راستا اختیار کر لیا ہے!

لہٰذا مذکورہ آیت کا بھی جاندار موجودات کے تدریجی ارتقاء سے کوئی تعلق نہیں۔

کیا یہ آیت اسلام کے آفاقی ہونے کے منافی ہے؟

سوال: آیت شریف "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" (سورۂ ابراہیم آیت ۴) کے مطابق کسی قوم میں سے کوئی پیغمبر نہیں اٹھا جس نے اس قوم کی زبان میں ہی اس سے بات نہ کی ہو اور اس کی لائی ہوئی آسمانی کتاب بھی انہیں لوگوں کی زبان میں ہوتی ہے لہٰذا اگر ایک پیغمبر کی نبوت اسی قوم کے لیے مخصوص ہو تو یہ طریقہ بے حد پسندیدہ ہوگا لیکن اگر اس کی نبوت آفاقی اور دنیا کے تمام لوگوں کے لیے ہو تو پھر یہ کیوں ضروری ہے کہ اس کی کتاب اس کی قوم کی زبان میں ہو، مثلاً جس طرح پیغمبر اسلامؐ کی لائی ہوئی کتاب عربی زبان میں ہے؟

جواب: جو پیغمبر لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجے جاتے تھے چونکہ سب سے پہلے ان کا سروکار اپنی قوم سے ہوتا تھا لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ان کی لائی ہوئی آسمانی کتاب ان کی اپنی قوم کی زبان میں ہو اور پھر وہ اپنی دعوت اور پیغام کی اشاعت مختلف طریقوں سے دوسری اقوام میں کریں۔

آجکل ہر ملک کے اہل علم حضرات کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی کتابیں اسی ملک کے لوگوں کی زبان میں لکھیں حالانکہ ان کتابوں کے مندرجات قطعاً اس علاقے کے لوگوں سے مخصوص نہیں ہوتے۔

چونکہ پیغمبر اسلامؐ عرب قوم میں سے اُٹھے اور ابتدائی مرحلے پر آپ کا واسطہ عرب قوموں اور قبیلوں سے پڑا اس لیے ان کی کتاب دنیا کی ایک وسیع اور زندہ زبان یعنی عربی میں ہے جبکہ اس کے قوانین اور احکام کا تعلق تمام بنی نوع انسان سے ہے۔

اگر رسول اکرمؐ کی بعثت کے وقت ایک عالمی اور بین الاقوامی زبان موجود ہوتی اور سب لوگ اسے جانتے ہوتے اور اس میں گفتگو کرتے تو اس صورت میں عین مناسب ہوتا کہ آپ کی آسمانی کتاب بھی اسی زبان میں ہو تاہم نہ تو اس زمانے میں ایسی کسی زبان کا وجود تھا اور نہ ہی اب تک اس سلسلے میں کوئی پیشرفت ہوئی ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس کی بنا پر قرآن مجید کا عربی زبان میں ہونا اسلام کے آفاقی مذہب ہونے کے قطعاً منافی نہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ مذکورہ بالا آیت کہتی ہے کہ خداوند تعالےٰ نے ہر پیغمبر کو اس کی اپنی قوم کی زبان میں پیغام دے کر بھیجا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس پیغمبر کی نبوت اور رہبری بھی اسی قوم کے لیے مخصوص ہے۔

کسی پیغمبر کی زبان یا کتاب کا اس کی قوم کی زبان میں ہونا اس کی نبوت کے اپنی قوم کے لیے مخصوص ہونے کی ہرگز دلیل نہیں بلکہ اس کے مذہب کے خصوصی یا عمومی ہونے کا فیصلہ دوسرے طریقوں سے کرنا چاہیے۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ اسلام نسل اور زبان سے بالاتر ہے اور ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھتا ہے اور یہ کہ قرآن مجید عربی زبان میں اس لیے ہے کہ دنیا میں کسی بین الاقوامی زبان کا وجود نہیں لہٰذا یہ بات اسلام کے ایک نسلی مذہب ہونے پر دلیل نہیں ہو سکتی۔

اسلام کے آفاقی مذہب ہونے کے بارے میں بہت سے مدارک دستیاب ہیں لیکن ان کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں۔ تفصیلات کے لیے جامعہ تعلیمات اسلامی کی شائع کردہ کتاب اسلام دین حکمت ملاحظہ فرمائیں۔

خداوند تعالےٰ اپنے لیے "ضمیر جمع" کیوں استعمال کرتا ہے؟

سوال: جب خداوند تعالےٰ "احد" اور "واحد" اور "یگانہ" ہے اور اپنی احدیت کے بارے میں جانتا ہے تو پھر وہ قرآن مجید میں اپنے لیے ضمیر جمع (ہم) کیوں استعمال کرتا ہے؟

جواب: ضمیر جمع متکلم (ہم) کا استعمال بولنے والے کی عظمت اور بزرگی کی نشانی ہے اور خداوند تعالےٰ کو اس کا استعمال سب سے زیادہ زیب دیتا ہے۔ ادباء کا کہنا ہے کہ ضمیر جمع متکلم کا استعمال عظمت کی دلیل منصور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بڑے لوگ عموماً تنہا نہیں ہوتے یعنی خدمتگار اور فرمانبردار اشخاص ان کے مقاصد کی تکمیل کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور یوں ہمیشہ ایک جماعت کو تشکیل دیتے ہیں۔ اسی معنی کی وجہ سے اس لفظ کا استعمال "عظمت" کا "کنایہ" ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے جب کبھی خداوند تعالےٰ کے کلام میں ضمیر جمع استعمال ہوتی ہے تو وہ ہمیں اس کی عظمت اور بزرگی کی یاد دلاتی ہے اور ہم کائنات کی ان ظاہر اور پوشیدہ قوتوں

کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں جو اس کے احکام کے تابع ہیں۔ یوں ہمارا توحید پر اعتقاد زیادہ پختہ ہوتا ہے اور ذات مقدس کی جانب ہماری توجہ زیادہ ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید میں سمع اور بصر

سوال: اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں کلمہ "سمع" مفرد آیا ہے لیکن "قلب" اور "بصر" کے کلمات جمع کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ

(سورۂ بقرہ آیت ۷)

خدا نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر ایک پردہ ہے۔"

جواب: بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہاں "سمع" مصدر کے معنوں میں ہے اور جب کبھی کسی کلمے پر مصدر کا اضافہ ہو جائے تو وہ مصدر جمع اور عموم کے معنی دیتا ہے اور اس کلمے کے جمع ہونے کا محتاج نہیں ہوتا لیکن دوسرے دو کلمے یعنی "قلب" اور "بصر" ایک "خاص عضو" کے اسم کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اس لیے جمع کی صورت میں آئے ہیں۔

بعض دوسرے محققین نے ان اسالیب بیان کے مابین تفاوت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ: ہر شخص اپنے قلب اور فکر سے گوناگوں چیزوں کا ادراک کرتا ہے اور اسی طرح آنکھ سے رنگوں، شکلوں اور پیمائش کا احساس کرتا ہے۔ ان دونوں اعضاء کے مدرکات متعدد اور غیر معمولی طور پر مختلف النوع ہیں۔ اس لحاظ سے گویا ہم میں سے ہر شخص متعدد قلب اور آنکھیں رکھتا ہے لیکن ہم میں سے ہر شخص قوتِ سامعہ سے فقط صوتی امواج کا ادراک کرسکتا ہے اور اسی وجہ سے "سمع" کا لفظ بطور مفرد استعمال ہوا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آوازیں بھی متنوع ہوتی ہیں لیکن اتنی نہیں جتنی وہ چیزیں ہوتی ہیں جو آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ امور بھی غیر معمولی طور پر متنوع ہوتے ہیں جن کا ادراک انسان سوچ بچار کے ذریعے کرتا ہے۔

جھوٹے معبود کیوں جلائے جائیں گے؟

سوال: سورۂ انبیاء کی ۹۸ ویں آیت میں ان جھوٹے معبودوں کے بارے میں جنہیں مشرک پوجتے تھے یوں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ

"اے مشرکو! تم اور وہ جھوٹے معبود جنہیں تم پوجتے ہو دوزخ کا ایندھن ہو اور تم اس میں وارد ہو گے۔"

اس بنا پر جھوٹے معبود دوزخ کی آگ میں جلیں گے جب کہ بعض جھوٹے معبودوں کا تعلق جاندار موجودات سے ہے (مثلاً حیوانات جنہیں جاہل اقوام پوجتی تھیں) ان جاندار موجودات کا کیا گناہ ہے کہ انہیں آگ میں جلایا جائے؟

جواب: جیسا کہ گرامی قدر شیعہ مفسر مرحوم "طبرسی" نے اپنی مشہور تفسیر "مجمع البیان" میں کہا ہے اس آیت میں مشرکین مکہ سے خطاب کیا گیا ہے اور سورۂ انبیاء کی تمام آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔ مکہ کے لوگوں

کے جھوٹے معبود لکڑی، دھات اور پتھر کے بنے ہوئے تھے اور جو معبود دوزخ کی آگ کا ایندھن ہیں وہ یہی بُت وغیرہ ہیں جنہیں نزولِ قرآن کے وقت لوگ پوجا کرتے تھے اور وہ زندہ معبود اس آیت میں داخل نہیں ہیں جنہیں بعض لوگ پوجتے ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپی کا موجب ہے کہ اس زمانے میں جزیرہ نمائے عرب کے بت پرست زندہ معبودوں کو نہیں پوجتے تھے۔

یہاں توجہ کے قابل نکتہ یہ ہے کہ خدا ان جھوٹے معبودوں کو دوزخ میں جلائے گا اور وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے تاکہ مشرکین سمجھ لیں کہ وہ جھوٹے معبود جو ان کی نظروں میں مقدس موجودات تھے وہ بالآخر کیونکر خود ان کی جان کے لیے آگ بن گئے اور ان کی بدبختی اور شقاوت کی وجہ قرار پائے اور یہ بھی جان لیں کہ یہ جھوٹے معبود جنہیں نادان انسان قادر اور توانا تصور کرتا تھا اپنے دفاع کے لیے رتی بھر قوّت بھی نہیں رکھتے۔

کیا خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہے؟

سوال: خداوند تعالیٰ سورۂ یوسف کی ۱۰۰ ویں آیت میں فرماتا ہے:

"وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَقَالَ یٰاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ز"

حضرت یوسفؑ اپنے باپ اور ماں کو حکومت کی کرسی پر لے گئے اور یوسفؑ کے ماں باپ اور بھائی آپ کے سامنے سجدے میں گر گئے اور یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا: جو خواب میں نے پہلے دیکھا تھا اس کی تعبیر یہی ہے۔

(کیونکہ یوسفؑ نے پہلے خواب میں دیکھا تھا کہ سورج اور چاند نیز گیارہ تارے ان کے سامنے سجدہ بجالا رہے ہیں)۔

ہم تواریخ میں پڑھتے ہیں کہ جب امیرالمومنینؑ صفّین کی جانب تشریف لے جارہے تھے تو ایک جماعت کے افراد جو راستے میں قطار باندھے کھڑے تھے، اس رسم اور احترام کے مطابق جو وہ پہلے ساسانی

سلاطین کے لیے روا رکھتے تھے، آپ کو دیکھتے ہی سجدے میں گر گئے۔
امیرالمومنینؑ نے یہ منظر دیکھا تو آپ کو بے حد کوفت ہوئی اور آپ نے
فرمایا: "تم کس گناہِ بے لذّت کے مرتکب ہو رہے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو
کیونکہ میں بھی تمہاری طرح خدا کی مخلوق ہوں"
کیا یہ تاریخی حقیقت مندرجہ بالا آیت کے منافی نہیں ؟"

جواب: پرستش کے طور پر سجدہ صرف خداتعالیٰ کی مقدس ذات سے مخصوص ہے
اور اس کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔

جیسا کہ حضرت امام صادقؑ اور حضرت امام ہادیؑ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوا ہے
حضرت یوسفؑ کے والد، والدہ اور بھائیوں نے یہ سجدہ خدا کے شکر کے طور پر ادا کیا تھا
اور جیسا کہ صاحب مجمع البیان نے کہا ہے "خر والہ سجدا" میں 'لہ' کی ضمیر حضرت یوسفؑ
کی جانب نہیں بلکہ خدا کی جانب گھومتی ہے یعنی انہوں نے خدا کو سجدہ کیا۔

جہاں تک فرشتوں کے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا تعلق ہے اس کا بھی یہی
مطلب ہے یعنی سجدہ تو خدا کے لیے تھا اور حضرت آدم کی حیثیت قبلہ کی تھی۔

اس بیان کے پیش نظر مذکورہ آیت کے درمیان جو تاریخی مطلب امام علیؑ سے
نقل کیا گیا ہے اس کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

توبہ "نصوح" سے کیا مراد ہے؟

سوال: لوگوں کے مابین آیت شریفہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا (سورہ تحریم آیت ۸)

کے بارے میں اختلاف ہے اس آیت کے معنی بالصراحت بیان کیجیے۔

جواب: لغت میں "نصح" کے معنی "خالص ہونے" کے ہیں۔ اس بنا پر "توبہ نصوح" سے مراد وہ توبہ ہے جو گناہ سے خالص یعنی پاک ہو اور ایسی خالص توبہ کے لیے لازم ہے کہ انسان دوبارہ اس گناہ کی طرف نہ لوٹ جائے۔ ائمہ علیہم السلام سے مروی متعدد روایات بھی اسی حقیقت کی تائید کرتی ہیں مثلاً ایک روایت کے مطابق امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "توبوا الی اللہ توبۃ نّصوحا" سے کیا مراد ہے تو امام علیہ السلام نے فرمایا: "یتوب العبد ثم لا یعود فیہ" یعنی مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے گناہ سے توبہ کرے اور پھر اس گناہ کی جانب نہ لوٹے۔ [1]

---

[1] اصول کافی

ایک اور حدیث میں دسویں امام حضرت ہادیؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا: ان یکون الباطن کالظاهر یعنی توبۂ نصوح یہ ہے کہ توبہ کرنے میں انسان کا باطن اس کے ظاہر کی مانند ہو۔[۱]

اس مضمون کی اور متعدد احادیث بھی وارد ہوئی ہیں اور وہ سب اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ توبۂ نصوح سے مراد وہ خالص توبہ ہے جس میں گناہ کی جانب بازگشت نہ ہو اور جس میں انسان کا ظاہر اور باطن یکساں ہو۔

---

[۱] معانی الاخبار

کیا یہ آیت مسئلہ "خلود" سے منافات رکھتی ہے؟

سوال: ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو لوگ بہشت میں وارد ہوتے ہیں وہ پھر وہاں سے باہر نہیں جاتے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں رہتے ہیں اور بہت سی آیات اس مسئلہ (خلود اور بہشت میں ہمیشہ رہنا) کو صریحاً ثابت کرتی ہیں لیکن سورۂ ہود کی ۱۰۸ ویں آیت سے بظاہر پتا چلتا ہے کہ ممکن ہے وہ ایک دن بہشت سے باہر چلے جائیں:

"وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ"

جب تک زمین اور آسمان برقرار ہیں سعادتمند افراد ہمیشہ کے لیے بہشت میں رہیں گے مگر یہ کہ تیرا خدا چاہے کہ انہیں وہاں سے باہر لے جائے اور یہ ایک جاری رہنے والی بخشش ہے۔

استثناء

بظاہر پتا چلتا ہے کہ ممکن ہے کہ ایک دن خدا چاہے کہ انہیں اس

مرکزِ نعمت سے باہر کر دے جب کہ باقی آیات اس امر پہ گواہ ہیں کہ وہ ہرگز بہشت سے باہر نہیں جائیں گے۔ اس صورت میں اس آیت کے کیا معنی ہیں؟

جواب: یہ درست ہے کہ خداوند عالم نے سعادتمند افراد سے بہت سی آیات میں دائمی بہشت کا وعدہ کیا ہے اور وہ اس وعدے کی خلاف ورزی ہرگز نہیں فرمائے گا اور وہ خود فرماتا ہے کہ "لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ" (سورۂ روم آیت ٦) یعنی خدا نے جو وعدے کیے ہیں وہ ان کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔"

لیکن ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ تصور کریں کہ اس قطعی وعدے کے بعد زمام کار خدا کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے اور پھر وہ یہ قدرت ہی نہیں رکھتا کہ انہیں جنت سے باہر نکال دے اور ان سے اپنی نعمت سلب کر لے اور علمی اور کلامی اصطلاح میں یہ حتمی فیصلہ خدا کی قدرت کو محدود کر دیتا ہے اور اس کی توانائی کی وسعت میں کمی کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "الا ما شاء ربک" کے جملے سے خداوند عالم اس حقیقت پہ زور دیتا ہے کہ باوجودیکہ اس نے ان سے دائمی بہشت کا وعدہ کیا ہے اور وہ ہرگز اپنے اس وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا تاہم یہ بات اس کی قدرت میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتی اور پھر بھی وہ تمام موجودات پر اختیار رکھتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے اور تمام چیزوں کے بارے میں اس کی قدرت محفوظ اور پائدار ہے۔

عین یہی جملہ (اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ) پہلے والی آیت میں بھی وارد ہوا ہے (جو دوزخیوں کے بارے میں ہے اور جس میں ان سے دائمی عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے) اور اس کی وجہ بھی وہی ہے جو پہلے والی آیت کے سلسلے میں بیان کی گئی ہے۔

جملہ "عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ" جو آیت کے آخر میں آیا ہے ان واضح قرائن میں سے ہے جو مندرجہ بالا تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔ یہ جملہ ظاہر کرتا ہے کہ خدا کا یہ عطیہ ثابت، پائدار اور جاری رہنے والا ہے اور جدا ہونے والا ہرگز نہیں۔

ہر کام شروع کرتے وقت خدا کا نام لینے کا کیا فائدہ ہے؟

سوال: یہ جو کہا جاتا ہے کہ کوئی کام شروع کرتے وقت بسم اللہ کہنا چاہیے اس کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: انسان کے عمل کی پاکیزگی کے سلسلے میں اللہ کی جانب توجہ دینے کی تاثیر کو مدِنظر رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ ہر کام کی ابتدا کے وقت اللہ کا نام لینا انسان کو صحیح عمل اور راستبازی کی جانب متوجہ کرتا ہے اور اگر اس گرانبہا مذہبی حکم کا اور کوئی فائدہ نہ بھی ہو تب بھی یہ چیز اس کی اہمیت کے لیے کافی ہے۔ اس بنا پر ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ کہنا اور اس کی ذات اقدس سے مدد چاہنا بجائے خود ایک تربیتی درس ہے اور انسان کو صحیح عمل اور راستبازی کی جانب دعوت دیتا ہے اور خیانت اور بداعمالی سے (جو کہ دورِ حاضر کی سماجی بدبختیوں کے ایک بہت بڑے حصے کا سرچشمہ ہے) باز رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں محدود اور کمزور انسان ہر لحظے میں اللہ کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ

'بسم اللہ' پڑھ کر اپنی نیاز مندی کا اظہار کرتا ہے اور خداوند عالم کی لامتناہی قدرت سے امداد طلب کرتا ہے تو رحیم' مہربان' قادر اور توانا پروردگار بھی اسے اپنی خاص رحمت اور عنایت میں شامل قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید کا تحریف سے محفوظ ہونا

سوال: کیا قرآن مجید پیغمبر اسلامؐ پر اسی موجودہ صورت میں نازل ہوا ہے اور اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی؟

جواب: یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید کی تحریف کا راگ زیادہ تر عیسائیوں اور یہودیوں کی جانب سے الاپا گیا ہے۔ چونکہ تاریخ کی مسلّم شہادت کے مطابق ان دونوں قوموں کی آسمانی کتابیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریف اور تغیر کا شکار ہو گئی ہیں اور اپنی اصلی قدر و قیمت اور اعتبار کھو بیٹھی ہیں اس لیے یہ کوشش کرتے ہیں کہ قرآن مجید کو بھی تحریف کی افواہوں سے آلودہ کر دیں۔

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ تورات کے نسخے بارہا مختلف تاریخی حوادث کے دوران اور بالخصوص بخت النصر کے یہودیوں پر حملے کے وقت ضائع ہو گئے اور بعد میں یہودیوں کے کچھ مذہبی لوگ انہیں احاطۂ تحریر میں لے آئے [1]

---

[1] کتاب "قاموس مقدس" اور "الھدیٰ الی دین المصطفیٰ" سے رجوع فرمائیں

جیسا کہ گواہی ملتی ہے چاروں انجیلیں حضرت عیسیٰؑ کے کئی سال بعد کچھ لوگوں کے وسیلے سے لکھی گئیں اور یوں جو انجیل حضرت عیسیٰؑ پر ایک کتاب کی شکل میں اتاری گئی تھی اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔[1] جن لوگوں نے اپنے تمام مذہبی اصول و معارف کی بنیاد ان کتابوں پر رکھی ہے جو اس قدر بے اعتبار اور بے قدر ہو چکی ہیں وہ اس بات پر مائل ہیں کہ قرآن مجید کو بھی اسی مقدر سے دوچار کر دیں اور کہیں کہ قرآن مجید بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریف کا شکار ہو گیا ہے حالانکہ اسلامی تاریخ کے تمام ادوار میں قرآن مجید کی جمع آوری اور نگہداشت یہودیت اور عیسائیت کے ادوار میں تورات اور انجیل کی تاریخ سے قطعاً قابلِ موازنہ نہیں ہے۔

تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قرآن مجید کی وضع کسی بھی اسلامی دور میں ابہام اور پیچیدگی سے دوچار نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں ہمیں دو موضوعات پر توجہ دینی چاہیے جو بہت سے سوالوں کے جواب مہیا کرتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب برپا کیا۔ اس نے ان کی سابقہ زندگی کو درہم برہم کر کے اس کی جگہ ایک نئی زندگی کو وجود بخشا جس کی بنیاد انسانی ایمان اور اصول پر استوار کی گئی۔ اس بنا پر قرآن مجید ایک ایسی کتاب تھی جو مسلمانوں کی زندگی کی اصلی کیفیات سے مربوط تھی اور وہ اپنی سیاست، معاشیات، قوانینِ اخلاق حتیٰ کہ اپنی گھریلو زندگی کی رسوم اور آداب بھی اسی آسمانی کتاب سے حاصل کرتے تھے۔ دن رات میں پانچ مرتبہ نماز کے دوران ان کا اس کتاب سے سابقہ پڑتا تھا اور بالآخر اپنی روزمرہ زندگی کے تمام معاملات میں وہ پہلے قرآن مجید اور پھر رسول اکرمؐ کی سنت اور روش سے رجوع کرتے تھے۔

یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو کتاب لوگوں کی زندگی سے اس قدر پیوستہ ہو اور وہ اس

---

[1] کتاب "قاموس مقدس" اور

سے اس حد تک رجوع اور استفادہ کرتے ہوں اس میں تحریف واقع ہو جائے اور عوام یا خواص اس واقعے کی جانب کوئی توجہ ہی نہ دیں؟ اس بات کا احتمال کہ قرآن مجید میں تحریف واقع ہو گئی ہو اور کسی نے اس بات کا خیال ہی نہ کیا ہو اسی طرح ہے جیسے کہ ہم اس بات کو ممکن سمجھ لیں کہ دنیا کی کسی بڑی قوم کے بنیادی قانون میں تحریف ہو جائے اور کوئی اس طرف دھیان ہی نہ دے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کا بنیادی قانون تحریف کا شکار ہو جائے لیکن لوگ کچھ نہ سمجھ پائیں اور احتجاج کی کوئی آواز بلند نہ ہو؟ موجودہ زمانے کی اقوام کی زندگی پر ایک بنیادی قانون کے نقش کے مقابلے میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر قرآن مجید کا نقش کئی گنا زیادہ تھا اور یوں لوگ اپنے اذہان میں اس کا اس قدر خیال کرتے تھے کہ اگر اس میں رتی بھر تحریف بھی واقع ہو جاتی تو اسے شدید ردِّ عمل سے دوچار ہونا پڑتا اور ہر جانب سے اعتراضات شروع ہو جاتے۔

(۲) کیا رسولِ اکرمؐ کے دور میں اور کیا بعد میں قرآن مجید کی جمع آوری سے مربوط تاریخ سے اور اس بے حد غیر معمولی اہمیت سے جو آنحضرتؐ اور مسلمان قرآن مجید کی حفاظت اور کتابت کو دیتے تھے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں کسی وجہ سے بھی ایک لفظ تک کی کمی کا بھی کبھی کوئی امکان نہیں رہا۔

ابو عبداللہ زنجانی کی کتاب تاریخ القرآن کے مطابق رسول اکرمؐ کے زمانے میں بہت سے اہل علم مسلمان جنکی تعداد ۴۳ تک لکھی گئی ہے آنحضرتؐ کے حکم کے مطابق ہر آیت اور سورے کو اسکے نازل ہوتے ہی لکھ لیتے تھے اور مسلمانوں کے درمیان ان تحریروں کی ہر ممکنہ اہتمام اور کوشش کیساتھ نگہداشت کی جاتی تھی۔ ان میں سے وہ معروف ترین بزرگوار جو قرآن مجید کی کتابت کے سلسلے میں دوسروں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اہتمام کرتے تھے ان میں امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا نام سرِ فہرست ہے۔ یوں وہ قرآن مجید جو ان افراد کے ذریعے لکھے جاتے تھے ان کے متعدد نسخے مسلمانوں میں موجود تھے اور وہ قرأت

اور قرآن مجید سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں دن رات ان سے رجوع کرتے تھے۔

علاوہ ازیں بہت سے مسلمانوں نے قرآن مجید کی آیات اور سورتیں حفظ کرلی تھیں۔ وہ قرآنِ مجید حفظ کرنے کے کام میں بے حد محتاط تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اس آسمانی کتاب کا ایک لفظ تک نہ چھوٹنے پائے۔ ان حضرات کو "قاری" کہا جاتا تھا اور لوگ قرأت قرآن کے سلسلے میں ہمیشہ ان سے رجوع کرکے استفادہ کرتے تھے۔

مسلمان قرآن مجید کی تحریف سے نگہداشت اور حفاظت کا اہتمام اس شدت سے کرتے تھے کہ جب حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانے میں جنگ یمامہ میں بہت سے قاریانِ قرآن قتل ہوگئے تو مسلمانوں نے قرآن مجید کی حفاظت کی جانب زیادہ توجہ دینے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے حصول کی خاطر قرآن مجید کے تمام نسخے ایک جگہ جمع کیے اور ان میں کوئی کمی بیشی ہونے کا سدِ باب کیا۔ ایک دفعہ پھر ان نسخوں کی حفاظت کی جانب بڑی شدت سے توجہ دی جانے لگی۔ حضرت عثمان بن عفان کی خلافت کے زمانے میں بھی قرآن مجید کے پہلے نسخوں سے چار نسخے تیار کیے گئے اور تمام اسلامی صوبوں کو روانہ کیے گئے تاکہ وہ اپنے یا موجود نسخوں کو ان نسخوں کے مطابق کریں اور قرآن مجید پڑھتے وقت ان کی متابعت کریں۔ قاری حضرات اور دوسرے مسلمان قرآن مجید کی حفاظت اور نگہداشت کی جانب اس حد تک توجہ دیتے تھے کہ ایک دن ابی بن کعب اور خلیفۂ وقت حضرت عثمان کے مابین سورۂ توبہ کی درج ذیل ۳۴ ویں آیت "وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کے بارے میں اختلاف پیدا ہوگیا۔

حضرت عثمان بن عفان کا کہنا تھا کہ وحی الٰہی میں لفظ "اَلَّذِیْنَ" سے (واؤ کے بغیر) اور یہ حرف قرآن مجید کے نسخوں میں سے حذف کردینا چاہیے، جبکہ "اُبیؓ" کا موقف یہ تھا کہ ہم نے یہ آیت رسولِ اکرمؐ سے اسی طرح سنی ہے جس طرح قرآن مجید کے نسخوں میں موجود ہے۔ جب بحث نے طول کھینچا تو اچانک ابیؓ نے بے حد سختی سے کہا:

"میں تلوار کندھے پر رکھ لوں گا اور جو شخص اس حرف کو قرآن مجید سے نکالنا چاہے گا اس کا خون بہا دوں گا۔"

ابیّ کے اصرار کی بنا پر خلیفہ نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔

جب قرآن مجید کا ایک حرف بدلنے کے سوال پر یہ سب کچھ ہوا تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید تحریف کا شکار ہو گیا ہے اور اس کی کچھ آیات حذف کر دی گئی ہیں۔

جو دو بنیادی باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان کے علاوہ اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس میں تحریف نہ ہونے اور اس آسمانی کتاب کے تغیر و تبدل کی دست برد سے محفوظ رہنے کی صراحت کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" (سورۂ حجر آیت ۹)

"ہم نے قرآن بھیجا ہے اور ہم اس کے حافظ اور نگہبان ہیں۔"

اسلامی علماء اور دانشمندوں نے بھی تفسیر اور کلام کی کتابوں میں صراحت کی ہے کہ اسلامی دانشمندوں کا اس مسئلے پر اجماع ہے کہ قرآن مجید میں کوئی تحریف نہیں ہوئی اور اگر دانشمندوں میں بھی کوئی ایسا شخص پیدا ہوا ہے جو تحریف کے موضوع پر اعتقاد رکھتا ہو تو اس کے اس اعتقاد کی وجہ جعلی روایات ہیں جو بعض خود غرض لوگوں نے احادیث کی کتابوں میں شامل کر دی ہیں ورنہ خود قرآن مجید میں ان کے دعوے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی روایات درجۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔

بصورت دیگر ایسا اعتقاد ان روایات کے زیر اثر پیدا ہوا ہے جن کے حقیقی معنی اور مفہوم ابھی تک منکشف نہیں ہوئے۔ بہر حال ہمارے بہت سے بزرگوں اور محققین نے اس بارے میں کتابیں لکھی ہیں اور قرآن مجید میں تغیر و تبدل کا ناممکن ہونا واضح طور پر ثابت کیا ہے۔

وہ روایات جن میں یہ کہا گیا ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام کے پاس قرآن کا ایک نسخہ تھا جو اس کے دوسرے نسخوں سے مختلف تھا، یہ روایات قرآن مجید میں "عدم تحریف"

کے مسئلے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ جیسا کہ علماء نے کہا ہے جو قرآن کریم امیر المومنین علی علیہ السلام نے جمع فرمایا تھا وہ آیات کے شانِ نزول کی اس شرح اور تفاسیر اور توضیحات پر مشتمل تھا جو آپ نے رسولِ اکرمؐ سے سنی تھیں اور دوسرے نسخوں سے اس کا فرق قرآن مجید کے اصل متن کے بارے میں نہیں بلکہ صرف اس حصے کے بارے میں تھا۔

قرآنِ مجید کی سورتوں کے نزول کی ترتیب اور کاتبانِ وحی

سوال: نزول کے مطابق قرآن مجید کی پہلی اور آخری سورتیں کونسی ہیں ؟
نزولِ وحی کے بعد قرآنِ مجید کن لوگوں کے ذریعے لکھا جاتا تھا ؟

جواب: معتبر اسلامی مورخین نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کے مطابق جو پہلی سورۃ رسولِ اکرمؐ پر نازل ہوئی وہ سورۃ "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" تھی اور آخر میں نازل ہونے والی سورۃ سورۃ توبہ تھی۔ ان دو سورتوں کے مضامین بھی اس قول کی تائید کرتے ہیں۔

جہاں تک رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں قرآنِ مجید کو ضبطِ تحریر میں لانے کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو آیات آپ پر نازل ہوتی تھیں انہیں آپ کے کچھ چیدہ اصحاب باقاعدگی سے آپ سے دریافت کرتے رہتے تھے اور کوفی خط کی ایک طرز میں لکھ لیتے تھے جو کہ ان دنوں خطِ متداول تھا۔ ان حضرات کو "کاتبِ وحی" یعنی وحی کے لکھنے والے کہا جاتا ہے۔ مورخین نے ان افراد کی تعداد ۴۳ تک لکھی ہے۔ ان ۴۳ حضرات میں سے امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور بعض دیگر اصحاب آیاتِ قرآنی کو

لکھنے کے کام میں باقی سب سے زیادہ محنت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی دقیق رہنمائی اور سرپرستی میں تمام نازل شدہ آیات لکھ لیتے۔

اس بات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کہ اسلام کی بنیاد اس آسمانی کتاب پر ہے اور یہ زندگی کے تمام اجتماعی اور انفرادی شعبوں میں مسلمانوں کا بنیادی قانون ہے، رسولِ اکرمؐ بنفسِ نفیس اس کے لکھوانے کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔

آنحضرتؐ کی رحلت کے وقت تمام قرآن تحریری شکل میں مسلمانوں کے پاس موجود تھا اور بہت سے لوگوں نے اسے حفظ بھی کر رکھا تھا۔ جو قرآن مجید اب مسلمانوں کے پاس موجود ہے وہ وہی ہے جو حضورؐ کی رحلت کے وقت مسلمانوں کے پاس موجود تھا۔

اپنی رائے سے تفسیر کرنا

سوال : بہت سی روایات میں وارد ہوا ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے اور صوابدید کے مطابق کرے اور اگر کوئی اس طرح کا اقدام کرے تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ "رائے" سے تفسیر کرنے سے کیا مراد ہے ؟

جواب: علمائے اسلام اور مفسرین قرآن اس نظریے پر متفق ہیں کہ کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ قرآن مجید کی آیات کی تفسیر اپنی ذاتی صوابدید اور رائے کے مطابق کرے۔ اس بارے میں بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں جن کے چند نمونے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :

(۱) رسول اکرمؐ نے فرمایا :

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِہٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ [۱]

---

[۱] بہت سی علمی کتابوں میں یہ حدیث آنحضرتؐ سے نقل کی گئی ہے ۔

جو شخص قرآن مجید کی تفسیر اپنی ذاتی رائے سے کرے وہ اپنے لیے آگ (دوزخ) میں جگہ کا انتخاب کرتا ہے۔

(۲) مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِرَاْیِہٖ[۱] فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ[۲]

(۳) مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ وَاَصَابَ الْحَقَّ فَقَدْ اَخْطَاءَ؛[۳]

جو شخص قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے سے کرے خواہ وہ درست ہی ہو تب بھی اس نے خطا کی ہے۔

یہ ان احادیث میں سے چند ایک کے متون ہیں جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ تفسیر بالرائے یا بغیر علم کے تفسیر کرنے سے کیا مراد ہے۔

عالی قدر مفسّرین نے تفسیر بالرائے کی تین وجوہ بیان فرمائی ہیں۔ ہم اجمالی طور پر ان سب کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(۱) مفسّر کا مناسب تحقیق سے پہلے رائے قائم کر لینا اس امر کا سبب بنتا ہے کہ جو لفظ دو معنی رکھتا ہو اور ان میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کی علامت موجود نہ ہو یا ایک آیت مفہوم اور مقصد کے لحاظ سے مبہم اور مجمل ہو اور دوسری آیات کے ذریعے اس کا اجمال اور ابہام رفع کرنا ضروری ہو وہ اس کی تفسیر یوں کرے کہ وہ اس کے پہلے سے قائم کردہ خیال کے مطابق ہو۔ دوسرے الفاظ میں سابقہ اعتقادات اور پیشگی قائم کی ہوئی رائے اس امر کا باعث بنتی ہے کہ

---

[۱] تفسیر الجامع الاحکام القرآن مؤلفہ قرطبی کی جلد اوّل صفحہ ۳۲ پر لفظ "بِرَاْیِہٖ" کی بجائے "برای" آیا ہے اور مجمع البیان کی پہلی جلد کے صفحہ ۹ پر اس کے بجائے لفظ "بغیر علم" یعنی ظن اور گمان نقل کیا گیا ہے۔

[۲] جامع البیان جلد ۳ - صفحہ ۳۲ -

[۳] التبیان جلد ۱۳ - صفحہ ۳ اور اس سلسلے میں روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔ مزید معلومات کے لیے تفسیر برہان جلد اوّل صفحہ ۱۸ - ۱۹ سے رجوع فرمائیں۔

انسان ایک آیت کی تفسیر (کسی قرینے اور شہادت کے بغیر) اپنے اعتقاد کے مطابق کرے اور بجائے اس کے کہ قرآن مجید کو اپنا ہادی اور رہبر قرار دے اسے اپنے عقائد کے مطابق ڈھال لے جب کہ اگر وہ پہلے سے اس اعتقاد کا حامل نہ ہوتا تو اس آیت کی اس انداز سے تفسیر کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتا۔ [۱]

اس قسم کی تفسیر بالرائے کے نمونے ان لوگوں کی کتابوں میں زیادہ نظر آتے ہیں جو خاص مکاتب مثلاً معتزلہ، اشاعرہ، باطنیہ اور صوفیہ کی پیروی کرتے ہیں۔ جس مفسر نے پہلے "اعتزال" یا "اشعری" مکتب کو خدا اور بندوں کی صفات اور افعال کے بارے میں مکمل طور پر قبول کر لیا ہو وہ جب ان آیات تک پہنچے جن کے متعلق ممکن ہو کہ وہ ان کی تطبیق اپنے خاص عقیدے سے کرے اور اندریں صورت کہ ان آیات کا ظاہر اس کے عقیدے کے خلاف ہو تو اپنے پہلے عقیدے کے زیر اثر وہ ایسی آیات کی تفسیر اپنے مکتب کے نظریے اور معتقدات کے مطابق کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنے عقائد کو قرآن مجید کے سامنے پیش کرے (یعنی قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھے) وہ قرآن مجید کو اپنے عقائد کے سامنے پیش کرتا ہے (یعنی قرآن مجید کی تفسیر اپنے عقیدے کے مطابق کرتا ہے) اور ہوا و ہوس کی بنا پر آیات الٰہی کو غلط معنی پہناتا ہے۔

زمخشری کی تحریر کردہ "تفسیر کشاف" [۲] مکتب "اعتزال" کی بنیاد پر قرآن مجید کی

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱ صفحہ ۱۲۔ الجامع الاحکام القرآن قرطبی جلد ۱ صفحہ ۳۲۔ آیات الاحکام محقق اردبیلی صفحہ ۲۔ تفسیر صافی مقدمہ پنجم صفحہ ۹۔ رسائل شیخ انصاری صفحہ ۳۵۔ چونکہ لفظ "رائے" عربی لغت میں ظن، گمان اور تخمین کے معنی میں ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مفسر کی سابقہ آراء کوئی قطعی نہ تھیں بلکہ قیاسات اور مفروضوں کا ایک سلسلہ تھا جنکی صحت اور استحکام کے بارے میں خود مفسر کو بھی پختہ یقین نہ تھا۔

[۲] معتزلہ اور اشاعرہ کے مابین مورد اختلاف مسائل سے متعلقہ آیات کی تفسیر کی روش پر اس کتاب کی تنقید ان نکات کی قدر و قیمت میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتی جو قرآن مجید کی خارق العادت فصاحت اور بلاغت کے سلسلے میں بیان کیے گئے ہیں کیونکہ اس بارے میں کشاف کی قدر و قیمت ناقابل انکار ہے۔

تفسیر کا جیتا جاگتا نمونہ ہے اور اسی طرح فخر رازی کی تحریر کردہ کتاب (مفاتیح الغیب) "اشعری" مکتب کی بنیاد پر قرآنی آیات کی تفسیر کی واضح مثال سمجھی جاتی ہے۔ ان دونوں مفسرین میں سے ہر ایک نے قرآنی آیات کے ذریعے اپنے پہلے عقیدے کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات پر ہرگز تیار نہیں ہوئے کہ اپنے آپ کو اپنے سابقہ عقائد سے آزاد کریں اور اپنے آپ کو سابقہ آراء سے آزاد کر کے ان تمام قرآنی آیات کو موردِ مطالعہ قرار دیں جو خداوند تعالیٰ کی صفات اور بندوں کے افعال کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں "باطنیہ" اور "صوفیہ" عقائد رکھنے والوں اور کچھ فلسفیوں نے عقلی معارف سے مربوط کچھ آیات کی تفسیر اپنے سابقہ نظریے کے مطابق کی ہے مثلاً ملا عبدالرزاق کاشی نے اپنی تفسیر کی بنیاد باطنیہ عقائد اور آراء پر رکھی ہے اور محی الدین ابن عربی[1] نے قرآن مجید کے معارف الٰہی کی تفسیر اپنے صوفیانہ نظریات کے مطابق کی ہے۔

یہ تفاسیر جو فقط ایک خاص مکتب کے احیاء کے لیے تحریر کی گئی ہیں (ایک ایسا مکتب جس کا بانی ایک جائز الخطاء اور غیر معصوم شخص تھا) اگر بالفرض ان میں سے کچھ صحیح بھی ہوں تب بھی مجموعی طور پر یہ تفسیر بالرائے سے خالی اور مبرا نہیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے اواخر اور چودھویں صدی کے شروع میں ہمارے خیالات کو ایک اور گرم اور بارونق بازار مل گیا اور اکتشافات اور اختراعات نے دوسرے انسانی علوم کو مات کر کے رکھ دیا۔ اس بنا پر اسلامی مفسرین کے لیے ایک مخصوص قسم کی تفسیر بالرائے کے لیے بنیاد وجود میں آ گئی اور نتیجے کے طور پر غیب اور ماورائے طبیعت عوالم سے مربوط آیات مثلاً روح، فرشتوں اور پیغمبروں کی تفسیر ایک خاص انداز سے ہونے لگی تاکہ طبیعی اور مادی دانشمندوں کی توجہ کھینچنے کے علاوہ قرآن مجید کی آیات کو ان کی نظروں میں جلاء اور خاص صفائی بخشی جا سکے اور "المنار" وغیرہ جیسی تفاسیر کے مطالعہ سے ہمارے

---

[1] کچھ محققین کا خیال ہے کہ جو تفسیر محی الدین ابن عربی سے منسوب ہے وہ اس نے خود نہیں لکھی بلکہ اس کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے۔

قول کی صداقت ظاہر ہو جاتی ہے (البتہ ان تفاسیر میں سے کئی ایک میں مثلاً المنار میں بہت سے قوی نکات بھی ہیں اور یہ بات بجائے خود قابلِ توجہ ہے)۔

چونکہ یہ دانشمند طبیعی اور دوسرے مادی علوم سے متاثر ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے غیبی اور ماوراء طبیعت عوالم سے مربوط بعض قرآنی حقائق کی تطبیق ایسی مادی اور طبیعی قوتوں سے کی جن کا انکشاف اس وقت کے علم نے کیا تھا حتیٰ کہ ان میں سے بعض کے خیال کے مطابق ملائکہ اور فرشتے طبیعت میں چھپی ہوئی قوتیں ہی ہیں

بعض ماہرینِ اخلاق، اخلاقی مسائل اور تصفیۂ نفس پر خاص توجہ کے زیرِ اثر کچھ آیات کی تفسیر کے سلسلے میں تفسیر بالرائے سے دوچار ہو گئے ہیں حتیٰ کہ انھوں نے شیطان کو نفس امارہ قرار دیا ہے اور انسانی نفس امارہ کے علاوہ شیطان نامی کسی موجود کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔

بعض اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کچھ لوگ آیت (اذھب الی فرعون انہ طغی) "فرعون کی طرف جا۔ اس نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے۔" میں "فرعون" کو تجاوز کرنے والے نفسِ انسانی کی جانب کنایہ تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق کسی خاص فرعون سے نہیں بلکہ اصلاحِ نفس اور تصفیۂ روح سے ہے۔[1]

یہ تمام تفاسیر ایک قسم کی تفسیر بالرائے ہیں کیونکہ پہلے سے قائم کی ہوئی رائے یا ماحول کی تاثیر اس امر کا موجب بنتی ہے کہ آیت کا ظاہر نظرانداز کر دیا جائے اور اس کے برعکس معنی اختیار کیے جائیں۔

(۲) تفسیر بالرائے کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک آیت کے ابتدائی معنوں کی پیروی کی جائے بغیر اس کے کہ ان قطعی دلائل اور قرآن مجید کی ان دوسری آیات پر غور کیا جائے جو اس سلسلے میں نازل ہوئی ہوں، مثلاً ان علمی دلائل اور دوسری آیات سے چشم پوشی کرتے ہوئے جو واضح طور خدا کے جسم ہونے کی نفی کرتی ہیں اور بعض

---

[1] براہین القرآن۔ صفحہ ۵۵

آیات کے ظواہر سے جو سب کے سب کنایہ اور مجاز ہیں خدا کے جسم ہونے پر استدلال کیا جائے اور مثلاً کہا جائے کہ "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ" اس بات کی دلیل ہے کہ خدا ہاتھ رکھتا ہے حالانکہ بلاشبہ یہاں 'ید' سے مراد ہاتھ نہیں بلکہ خدا کی قدرت کی جانب کنایہ ہے۔

(۳) تفسیر بالرائے کے تیسرے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر کے لیے خود قرآن کے علاوہ کسی دوسرے سے مدد طلب کی جائے کیونکہ احکام سے مربوط آیات کے علاوہ تمام قرآنی آیات اپنی آیات کے اجمال کو رفع کر سکتی ہیں اور قرآن مجید کی تفسیر کے سلسلے میں ہمیں صحابہ اور تابعین کے ادراک کی حاجت نہیں۔[۱]

کشف الظنون[۲] کے مؤلف نے تفسیر "بالرائے" کی پانچ اقسام کا ذکر کیا ہے جن کی بنیادی باتیں وہی ہیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔

یہاں اس نکتے کا بیان کرنا ضروری ہے کہ تفسیر بالرائے کے جو مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں ان کے درمیان کسی اسلامی مفسر نے یہ نہیں کہا کہ تفسیر بالرائے سے رسولِ اکرم کی مراد "تفسیر بہ عقل" ہے تاکہ ہم اس پر اعتراض کریں اور کہیں کہ:

"انھوں نے یہ معنی اس لیے کیے ہیں تاکہ لوگ قرآن مجید کو نہ سمجھ سکیں اور قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کی طرح جو تورات اور انجیل کو اپنے قبضے میں رکھتے تھے یہ بھی اس آسمانی کتاب کو اپنے قبضے میں رکھیں اور قرآن کے بارے میں غور و فکر سے منع کر کے اسے ایک ایسی کتاب کی شکل دے دیں جس کا فقط جسم تو لوگوں کے درمیان ہو اور اس کی روح نامعلوم رہے اور اس کی حیثیت مقدس الفاظ و اوراد، پراسرار، معمّا اور سمجھ میں نہ آنے والی آواز کی رہ جائے۔"

جن اسلامی مفسرین نے تفسیر بالرائے کے بارے میں گفتگو کی ہے انھوں نے

---

[۱] المیزان جلد ۳ - صفحات ۸۵ - ۸۶ [۲] مقدمہ مجمع البیان - صفحہ ۶

زیرِ بحث احادیث کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ مسلمان دانشمند اور بالخصوص شیعہ دانشمند عقل کو خدا کی ایک حجت اور قاطع دلیل سمجھتے ہیں حتیٰ کہ اسے کتاب و سنت اور اجماع کی صف میں شمار کرتے ہیں۔

وہ یہ کیسے کر سکتے ہیں کہ لفظ "رائے" سے جو رسولِ اکرمؐ کی حدیث میں وارد ہوا ہے عقل و خرد مراد لیں جب کہ عربی لغت میں جو قرآن مجید اور حدیث کے الفاظ کی تفسیر کے لیے لکھی گئی ہے مذکورہ لفظ کے معنی ظن، گمان، حدس اور تخمین بیان کیے گئے ہیں [۱]

اگر ایک گروہ کے لوگ (اخباری) ان آیات کے ظاہر پر عمل نہیں کرتے جن کا تعلق فروع اور عملی احکام سے ہے تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر عقل سے نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیات کا یہ سلسلہ ناسخ اور منسوخ عام اور خاص اور مطلق اور مقید کا پہلو رکھتا ہے اور ہمارے لیے ان چیزوں کی تشخیص ائمہ اہلبیتؑ سے رجوع کیے بغیر ممکن نہیں۔ اسی بنا پر اس قسم کی آیات کے ظاہر پر عمل نہیں کیا جاتا۔

علاوہ ازیں بالفرض اگر ایک یا دو گمنام افراد نے ایسی ناروا بات کہی بھی ہو تو کیا یہ درست ہوگا کہ ایسے بے بنیاد الزام کو اس طرح پیش کیا جائے کہ انسان تصور کرے کہ مختلف اسلامی ادوار میں اسلامی علماء اور دانشمند لوگوں کو قرآن مجید کے سمجھنے سے باز رکھتے تھے اور اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ لوگ قرآن مجید کا ادراک کر سکیں جب کہ انہیں علماء اور دانشمندوں نے قرآن مجید پر دنیا کی مختلف زبانوں میں سینکڑوں تفسیریں لکھی ہیں اور جو تفاسیر علمائے اسلام نے اب تک قرآن مجید پر لکھی ہیں ان کی تعداد معلوم کرنے کے لیے "کشف الظنون" اور "الذریعہ" نامی کتابوں سے رجوع کیا جائے۔ [۲]

---

[۱] مفردات راغب، مادہ "رائے" لکھتا ہے: رائے اس سے عبارت ہے کہ معاملے کی ایک طرف کو ظن اور گمان کی رو سے ترجیح دی جائے۔

بعد میں آیت يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ (سورۂ آلِ عمران آیت ۱۳) سے استدلال کرتا ہے کیونکہ اس آیت میں رائے ظن اور گمان کے معنی میں ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں "وہ انہیں اپنے آپ سے دگنا سمجھتے تھے" (۲ صفحہ ۲۰۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ یہ چاہتے کہ تورات اور انجیل کی طرح قرآن مجید فقط انہیں تک محدود رہے تو پھر دنیا کی مختلف زبانوں میں اس آسمانی کتاب پر یہ سب تفاسیر کیوں لکھتے اور قرآنی آیات کی تمام خصوصیات پر عقل اور نقل کی رو سے بحث اور گفتگو کیوں کرتے۔

اس بات کے کہنے والے نے ایک اور غلطی یہ کھائی ہے کہ اس نے حدیث:

"مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَأْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ"

جو شخص قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرے گا اس کی مقعد آگ سے بھر دی جائے گی۔"

حالانکہ مادہ "تَبَوَّأَ" جس سے "فلیتبوا" لیا گیا ہے "پُر کرنے" کے معنی میں نہیں آیا بلکہ اس کے معنی جگہ تیار کرنے اور حاصل کرنے کے ہیں۔

علاوہ ازیں بات کہنے والے کی گفتگو میں لفظ "مقعد" کے معنی مخصوص مقام کے لیے گئے ہیں حالانکہ ایسا قطعاً نہیں ہے بلکہ حدیث میں اس سے مراد مکان اور جگہ ہے نہ کہ مخصوص مقام۔ مندرجہ ذیل آیت میں دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور دونوں الفاظ کا مفہوم وہی ہے جو بیان کیا گیا:

.... تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (سورۂ آل عمران آیت ۱۲۱)

"... تو ایمان والوں کو جنگ کے مقامات پر لڑنے کے لیے جگہ دیتا ہے"

(یا تو ان کے لیے لڑنے کے لیے مقامات تیار کرتا ہے)، [۱]

لہٰذا اس حدیث کے صحیح معنی یہ ہیں:

(صفحہ ۲۰۷ سے آگے) کتاب کشف الظنون جلد ۱ صفحات ۳۰۲ تا ۳۱۶ اور علامہ مرحوم حاج آغا بزرگ تہرانی کی تالیف الذریعہ جلد ۴ صفحات ۲۳۱ تا ۳۴۵ سے رجوع فرمائیں۔

[۱] تفسیر مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۴۹۵ اور مفردات راغب صفحہ ۶۹ اور سورۂ یوسف کی ۵۶ ویں آیت کی تفسیر سے رجوع فرمائیں۔

جو شخص قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے سے کرے اسے چاہیے کہ دوزخ کی آگ میں سے اپنے لیے جگہ کا انتخاب کرلے یا اپنے لیے آگ میں سے جگہ تیار کرلے۔

(اور جن لوگوں نے حدیث کے کوئی اور معنی کیے ہیں ان کا یہ فعل ان کی عربی ادبیات سے ناواقفیت کی دلیل ہے)۔

قرآن مجید میں تکرار کا مقصد کیا ہے ؟

سوال: قرآن مجید میں کچھ آیات کی تکرار کیوں کی گئی ہے اور اسی طرح کچھ داستانیں متعدد مقامات پر کیوں بیان کی گئی ہیں ؟

جواب: یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید ۲۳ سال کی مدّت میں اور مختلف مواقع، حوادث اور حالات کے مطابق نازل ہوا ہے۔ قرآن مجید ایک خشک قانونی کتاب یا ایک کلاسیکی کتاب نہیں ہے جو قوانین اور علمی مسائل کو شق وار کرکے بیان فرمائے۔ قرآن مجید ارشاد، تبلیغ اور ہدایت کی کتاب ہے اور اس کا ہدف یہ ہے کہ انسانی زندگی کے حقائق اور وہ احکام بیان کرے جو کمالِ انسانی تک پہنچنے کے لیے ضروری ہیں اور لوگوں کی روحوں اور خیالوں میں نفوذ کرکے اور صحیح اجتماعی قوانین وضع کرکے ایک ایسا معاشرہ وجود میں لائے جو مادی اور معنوی دونوں قسم کے کمالات کا حامل ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے قرآن مجید نے تمام ضروری موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ قرآن مجید بتدریج اور مختلف حالات میں گوناگوں

ضروریات کا جواب دینے کے لیے ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوا ہے :

اب جہاں تک تکرار کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ تکرار کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) کچھ تاریخی داستانوں کی تکرار ۔

(۲) بعض ان آیات کی تکرار جو کوئی "خاص حقیقت" بیان کرتی ہیں ۔

تاریخی داستانوں کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ کا ذکر کرنے سے قرآن مجید کا مقصد لوگوں کی توجہ زندگی کے ان مسلمہ قوانین کی طرف مبذول کرانا ہے جو گزشتہ لوگوں کی زندگیوں پر حکومت کرتے رہے ہیں ۔

قرآن مجید چاہتا ہے کہ لوگوں کو ان قوانین سے آشنا کرے اور انہیں اس بات کی جانب متوجہ کرے کہ گزشتہ معاشروں اور قوموں کی ترقی اور پیشرفت یا انحطاط کی وجوہ کیا رہی ہیں ؟ ان کے پیغمبروں کی دعوت قبول کرنے سے انکار سے کیا خطرناک نتائج برآمد ہوئے ہیں ؟ ظلم و ستم کو رواج دینے سے ان پر کیا بیتی ہے ؟ وہ کونسے عوامل تھے جو ان کی تباہی اور بربادی کا موجب بنے ؟ اور بالآخر ان کی کمزوری اور قوت کی نشانیاں کیا تھیں ؟

قرآن مجید نے ان داستانوں میں لوگوں کو ان حقائق اور قوانین کی جانب متوجہ کیا ہے اور اسی طرح سرکش اور ظالم افراد کی نافرمانیوں کے انجام کی نشاندہی کی ہے ۔

یہی حقیقت اس بات کا سبب بنی کہ قرآن مجید سابقہ معاشروں کی سرگزشت کی چھان بین کرے اور ان کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرے لہٰذا قرآن مجید مختلف مواقع پر مثلاً "بنی اسرائیل" یا "تخلیق آدمؑ" کا ذکر کرتا ہے تو وہ ہر موقع پر اس موضوع کے کسی خاص حصے اور بلندی کی جانب اشارہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر موقع پر لوگوں کی توجہ کسی ایسے خاص نکتے کی جانب دلائے جس کی جانب دوسرے موقع پر توجہ نہ دی گئی ہو ۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا پتا قرآن مجید کی داستانوں پر غور کرنے سے چلتا ہے ۔

جن دوسرے مواقع پر کچھ آیات کی تکرار ہوئی ہے (مثلاً سورۂ رحمٰن میں آیت شریفہ

"فبای الاء ربکما تکذبٰن" کی تکرار، ان کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تکرار قرآن مجید کے پڑھنے والوں اور سننے والوں کی طبیعت پر خاص نفسیاتی تاثیر سے اچھے نتائج برآمد کرنے کی غرض سے ہے۔ جب خدا کسی قوم کی روح اور فکر کو بیدار کرنے کے لیے کلام فرماتا ہے تو بعض اوقات ایسے موضوعات پر تکیہ کرتا ہے جو خاص نفسیاتی اور جذباتی پہلو رکھتے ہوں مثلاً اسی سورۂ رحمٰن میں خدا دہ اہم نعمتیں گنواتا ہے جو انسان کی تخلیق اور معاشرے اور انسانی تمدن کی تشکیل اور اس کی بقا پر بنیادی اثر ڈالتی ہیں اور اسی طرح ان بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کو دوسری دنیا کی زندگی کے لیے مہیا کی گئی ہیں۔ ان نعمتوں کو گنوانے کے دوران میں جس کا مقصد انسان کے جذبات کو ابھارنا ہے۔ خدا آیت "فبای الاء ربکما تکذبٰن" کی تکرار فرماتا ہے اور اس طریقے سے ان نعمتوں کو شمار کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی حق شناسی کی حس کو بیدار کرتا ہے اور اسے حقیقت کے مقابلے میں فروتنی پر آمادہ کرتا ہے اور اس کے وجدان اور احساسات کو ابھارتا ہے لہٰذا اس قسم کی تکرار بجائے خود ارشاد اور ہدایت کے نقطۂ نگاہ سے ضروری ہے اور نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت میں خلل انداز نہیں ہوتی بلکہ اس کا شمار محسناتِ کلام میں ہوتا ہے کیونکہ یہ بیشتر تاکید اور تاثیر کا موجب بنتی ہے۔

اس قسم کی تکرار اردو، فارسی اور عربی ادبیات میں بکثرت پائی جاتی ہے اور عربوں کے قصیدوں کی بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جو ایک بیت، ایک مصرعے یا ایک جملے کی تکرار پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ایک مرثیے میں جو امراء القیس کے ماموں عدی بن ربیعہ نے اپنے بھائی کلیب کی یاد میں لکھا ہے جملہ "علی ان لیس عدلا من کلیب" کی تکرار بیس مرتبہ ہوئی ہے۔ اردو زبان کے عظیم شاعروں خصوصاً ڈاکٹر اقبال کے اشعار میں بھی اس قسم کی تکرار کے نمونے ملتے ہیں۔

کیا ممنوعہ درخت دانش کا درخت ہے؟

سوال: "دروس تاریخ ادیان" کے سلسلے میں ہم یوں پڑھتے ہیں:

میوۂ ممنوع کیا ہے؟

.... جیسا کہ تورات بالتصریح اور قرآن مجید اشارتاً کہتا ہے (میوۂ ممنوع) "بصیرت" ہے کیونکہ آیاتِ قرآنی کی بنا پر اللہ تعالےٰ آدم اور حوا کو آواز دیتا تھا اور اپنی عریانی کی وجہ سے کوئی شرم محسوس کیے بغیر وہ اسے جواب دیتے تھے لیکن میوۂ ممنوع کھانے کے بعد انہیں اپنی عریانی سے شرم آنے لگی اور وہ چھپ گئے۔

یہ کہ گزشتہ ایام میں وہ کسی شرم کے بغیر خدا کا دیدار کیا کرتے تھے اور آج میوہ کھانے کے بعد اپنی عریانی سے شرمارہے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ کل تک وہ جس حالت میں تھے (عریاں) اسے دیکھ نہیں سکتے تھے اور آج ممنوع میوہ کھا لینے پر انہیں بینائی حاصل ہو گئی ہے۔ پس ممنوع درخت بصیرت کا درخت ہے۔

خدا کیا چاہتا تھا۔

آیا انسان میوۂ ممنوع کھائے یا نہ کھائے ؟

اس مسئلے کو انسانی داستانوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے کہ مثلاً اللہ تعالےٰ نہیں چاہتا تھا کہ آدم ممنوع میوہ کھائے۔ اگر اسے یہ چیز ناگوار گزرتی تھی تو وہ آدم کو میوہ نہ کھانے دیتا (کیونکہ انسان کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور وہ پروردگارِ عالم جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے) لہذا اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ انسان اس میوے کو کھائے کیونکہ وہ میوہ کھائے بغیر انسان وجود میں نہیں آسکتا تھا اور یہ ایک ایسا منصوبہ ہے جس کا اہتمام اللہ تعالیٰ نے خود کیا ہے تاکہ انسان وجود میں آئے۔ وہی انسان جو اس وقت موجود ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وارد ہوتا رہے گا۔

جیسا کہ مندرجہ بالا بحث میں ذکر کیا گیا ہے کیا ممنوعہ میوہ بصیرت اور علم و دانش ہی ہے ؟

جواب: ان "دروس" کے مندرجات کے بارے میں ہم سے بہت سے سوالات کیے گئے ہیں جن کا ایک نمونہ مندرجہ بالا سوال ہے۔ اس کے واضح جواب کے لیے ضروری ہے کہ ہم چند نکات کا ذکر کریں:

۱- جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے موجودہ تورات کی تحریف کی ایک واضح ترین دلیل یہی ہے کہ تخلیقِ آدم کی داستان میں وہ پوری صراحت سے کہتی ہے کہ ممنوع درخت "علم و دانش" یا "نیکی اور بدی" یا "بصیرت" یا "معرفت" کا درخت تھا (تورات کے تمام ترجموں میں وضاحتیں کی گئی ہیں جو سب کی سب ایک معنی کی طرف لوٹتی ہیں)۔ پس تورات کے صریح اعلان کے مطابق بشر کا پہلا اور سب سے بڑا گناہ علم اور دانش کا گناہ تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اربابِ کلیسا قرونِ وسطیٰ کے تاریک دور میں علم و دانش اور علماء اور دانشمندوں کے

خلاف جنگ کرتے تھے اور اس گناہ کے پھیلاؤ سے وحشت زدہ تھے۔ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ پہلے دن آدم اس قدر بے علم تھے کہ انہیں اپنی عریانی سے حیا نہیں آتی تھی لیکن جب انہوں نے ممنوعہ درخت (علم و دانش) کا میوہ کھا لیا اور یوں کہیے کہ ایک منطقی آدم بن گئے تب وہ گنہگار ہو گئے اور انہیں بہشت سے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قرب سے دُور کر دیا گیا۔

بلاشبہ یہ باتیں تاریک ادوار کی خرافات اور من گھڑت قصے ہیں۔

اس کے برعکس قرآن مجید فرماتا ہے کہ:

بہشت میں قیام پذیر ہونے سے پہلے آدم علیہ السلام وسیع علم و دانش کے مالک تھے اور شجرۂ علم و دانش سے کافی حد تک بہرہ مند ہو چکے تھے حتیٰ کہ فرشتوں کے معلم اور استاد بن گئے تھے۔

"ہم نے آدمؑ کو سارے نام سکھا دیے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۳۱)

لہٰذا یہ آدم اس آدم سے قطعاً مختلف ہے جس کی تصویر کشی تورات نے کی ہے۔ اس آدم کی قوت کا بزرگ ترین سرچشمہ علم اور بصیرت ہے اور اُس آدم کا سب سے بڑا گناہ علم ہے۔ یہ آدم صحیح معنوں میں "آدم" ہے اور وہ آدم ہر مقام سے بے خبر ہے۔ یہ آدم بصیرت کی خاطر پیدا کیا گیا ہے اور اُس آدم کو حکم ملا ہے کہ سوجھ بوجھ، بصیرت اور علم کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دے۔ اس صورتِ حال میں یہ واقعی عجیب بات ہے کہ قرآن مجید اور تحریف شدہ تورات کی منطق کو اس سلسلے میں ایک سمجھا جائے۔

۲۔ تورات کا کہنا ہے کہ آدم و حوا پہلے عریاں تھے اور اپنی عریانی سے کوئی حیا محسوس نہیں کرتے تھے۔[1] یہ درست ہے لیکن قرآن مجید کہاں کہتا ہے کہ وہ دونوں برہنہ تھے اور اپنی برہنگی سے شرم نہیں کھاتے تھے بلکہ اس کے برعکس قرآن مجید

---

[1] .... اور آدم اور اس کی بیوی دونوں برہنہ تھے اور انہیں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ (تورات۔ سفر تکوین۔ فصل دوم۔ جملہ ۲۵)

تصریح کرتا ہے کہ شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے سے پہلے دونوں کے بدنوں پر لباس تھا اور یہ لباس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے بعد ان کے بدنوں سے گر گیا اور ان کے بدن برہنہ ہو گئے۔

"اسی نے ان دونوں سے (بہشتی) لباس اتروایا تاکہ ان دونوں کو ان کی شرمگاہیں دکھا دے۔" (سورۂ اعراف - آیت ۲۷)

مزید ارشاد ہوا ہے:

"شیطان نے انہیں وسوسے میں ڈالا تاکہ ان کے بدنوں کے جو حصے پوشیدہ تھے انہیں ظاہر کر دے۔" (سورۂ اعراف - آیت ۲۰)

اس بنا پر اسی سورے کی ۲۲ ویں آیت میں جملہ "ان پر ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں" بھی ان کے لباس اتر جانے اور ان کے برہنہ ہو جانے کے معنی میں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ برہنہ تھے اور اس بات کو نہیں سمجھتے تھے۔

پس جس آدم کا تعارف قرآن مجید کراتا ہے وہ شروع میں ہی لباس و پوشاک والا باعزت "انسان" تھا اور نافرمانی کی بنا پر برہنہ ہو گیا۔ (یہ نکتہ غور طلب ہے)۔

اس کے برعکس جس آدم کا تعارف تورات کراتی ہے وہ ابتدا ہی سے حیوانات کی مانند برہنہ تھا حتیٰ کہ اپنی برہنگی سے شرم بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ قرآن مجید کی اس صراحت کے باوجود کیا یہ مناسب ہے کہ ایسی بات اس سے منسوب کی جائے اور اسے تورات کے ساتھ لا کھڑا کیا جائے؟

۳۔ سب سے دلچسپ چیز "نہ کھا" کے معنی "تجھے کھانا چاہیے" کرنا ہے۔ کیا کلام میں اس سے بڑھ کر کوئی بھی گڈمڈ ہو سکتی ہے کہ نفی کو اثبات کے اور برے کو اچھے کے معنی دے دیے جائیں؟ اگر اس درخت کا پھل کھانا چاہیے تھا تو پھر اس کا نام شجرۂ ممنوعہ کیوں رکھا گیا؟

ہاں! یہ تفسیر اور معنی بیان کرنے کا کونسا طریقہ ہے؟ اگر یوں معنی کرنا صحیح ہے تو بہتر ہو گا کہ قرآن مجید میں جن جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان کے بارے میں بھی اسی طرح

فیصلہ دیا جائے اور کہا جائے کہ خدا چاہتا تھا کہ یہ ممنوعہ اعمال انجام دیے جائیں اور اگر وہ یہ نہ چاہتا تو ان کی انجام دہی سے روک دیتا۔ کیا ہم اپنے اعمال کے سلسلے میں مجبور ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ہم آزاد رہیں۔ اس نے انسانوں کو ارادے کی آزادی دی ہے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کے لیے بہت سے شرعی احکام بھی صادر کیے ہیں۔

پس یہ استدلال قطعاً غیر صحیح ہے کہ اگر خدا نہ چاہتا (کہ آدم میوۂ ممنوع کھائے) تو وہ آدم کو روک دیتا کیونکہ بعینہٖ یہ استدلال گنہگاروں کے بارے میں بھی صادق آئیگا۔ درحقیقت یہاں ارادۂ تکوینی اور ارادۂ تشریعی کے بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ (غور فرمائیں)

قارئینِ گرامی! جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کے پیش نظر کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہیں کہ اس قسم کے مطالب کو درس کی شکل میں شائع کرنے سے پہلے اسلامی مسائل کے ماہرین کو دکھا دیا جائے اور بعد میں شائع کیا جائے تاکہ اس قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہی نہ ہوں؟

خیال فرمائیے کہ اگر ایک شخص اس کتاب کو پڑھے اور باور کرے کہ ممنوعہ درخت علم و دانش کا درخت تھا اور آدم و حوا ابتدا میں حیوانات کی طرح برہنہ تھے اور وہ اس بات کو جانتے ہی نہ تھے اور علم کے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کے بعد انہیں اس بات کا پتا چلا تو وہ اللہ کی نگاہ سے پنہاں ہو گئے اور بعد میں حصول علم و دانش کے جرم کی پاداش میں بہشت سے نکال دیے گئے تو پھر اس (کے اس عقیدے) کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی جب کہ قرآن مجید کی منطق اس کے بالکل برعکس ہے؟

تعلیماتِ اسلامی کے سرچشموں سے جس چیز کا پتا چلتا ہے وہ یہ ہے کہ ممنوعہ درخت "حسد اور ایک طرح کی رقابت کا درخت" یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز تھی اور آدم اس میں گرفتار ہو گئے۔ (البتہ یہ اس قسم کا حسد نہ تھا جو گناہ کے مرحلے پر پہنچ جائے یا اس کی وجہ سے باقاعدہ گناہ سے آلودہ ہو جائیں):

اس قول کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ حضرت آدم مستقبل بعید میں اپنی اولاد

کی کیفیت سے آگاہ ہوگئے اور ان کے درمیان ایسے جلیل القدر پیغمبروں کو دیکھا جو خود ان سے زیادہ بلند مرتبہ تھے۔ اس موقع پر انہوں نے آرزو کی کہ ان بزرگواروں کا مقام خود انہیں حاصل ہو جاتا حالانکہ اپنی تمام تر شائستگی کے باوجود وہ شائستگی کے اس مرحلے پر نہیں پہنچے تھے۔ اسی آرزو نے انہیں بہشت سے دُور کر دیا اور یہی ان کا شجرۂ ممنوعہ تھی۔ البتہ بعض روایات میں دانۂ گندم وغیرہ کو شجرۂ ممنوعہ قرار دیا گیا ہے جس کے استعمال کی ممانعت آزمائشی پہلو رکھتی تھی۔

سورۂ برأت کے شروع میں 'بسم اللہ' کیوں نہیں ؟

سوال : سورۂ برأت کے شروع میں 'بسم اللہ' کیوں نہیں اور سورۂ نمل کے وسط میں 'بسم اللہ' کیوں دیکھنے میں آتی ہے ؟

جواب : چونکہ سورۂ برأت ' جیسا کہ اس کے مندرجات سے ظاہر ہے ' مشرکین اور عہدشکن لوگوں کی تہدید کے لیے نازل ہوئی تھی اور اس کا مقصد ایسے لوگوں کو خبردار کرنا تھا جو اپنی تمام قوت کے ساتھ جزیرۃ العرب میں نورِ توحید یگانہ پرستی اور اخلاقی و اجتماعی اصلاحات کو ملیا میٹ کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ لہٰذا یہ مناسب نہ تھا کہ اس کی ابتدا 'بسم اللہ' سے کی جائے کیونکہ یہ جملہ رحمت ' صلح وصفائی اور دوستی کی علامت ہے۔

جہاں تک سورۂ نمل کے وسط میں "بسم اللہ" کے ذکر کرنے کا تعلق ہے یہ اس خط کا سر آغاز ہے جو حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سباء کو لکھا تھا اور چونکہ قرآن مجید میں اس خط کا پورا مضمون نقل ہوا ہے اس لیے 'بسم اللہ' کا ذکر بھی آیا ہے کیونکہ اسی سے اس خط کی ابتداء ہوئی ہے۔

کیا کئی ایک خالق وجود رکھتے ہیں؟

سوال: اللہ تعالےٰ سورۂ مومنون کی ۱۴ ویں آیت میں فرماتا ہے:

"بزرگ اور بابرکت ہے وہ خدا جو پیدا کرنے والوں میں سے بہترین ہے"۔ جب خدائے تعالےٰ اپنے آپ کو "احسن الخالقین" کہتا ہے تو کیا اس کے علاوہ کوئی اور آفریدگار بھی وجود رکھتا ہے؟

جواب: عربی لغت کی رو سے مادہ "خلق" تین معنوں میں آتا ہے:

۱۔ کسی چیز کا پرکھنا اور اندازہ لگانا۔

۲۔ کسی چیز کی تشریح کرنا اور اس کا ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل کرنا مثلاً لوہے یا دوسرے مواد سے مختلف اقسام کے اوزار بنانا۔

۳۔ کسی چیز کا عدم سے وجود میں لانا یعنی ایک ایسی چیز کو ہستی بخشنا جس کا پہلے سے کوئی وجود نہ ہو۔

بلاشبہ تیسرے معنی اللہ تعالےٰ کے لیے مخصوص ہیں اور "خالق" اور "آفریدگار" کے الفاظ اس کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتے تاہم پہلے اور دوسرے

معنوں کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی آیات میں "خلق" کا مادہ بعض اوقات پہلے یا دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

"جب تو مٹی سے پرندوں کی صورت کی مانند صورت بناتا ہے"۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۱۰)

اس آیت میں "خلق" کے معنی ایک صورت بنانے اور ایک صورت کو دوسری صورت میں تبدیل کرنے کے ہیں۔

جس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس میں بھی "خلق" یا دوسرے معنوں میں ہے یا پھر پہلے معنوں میں ہے اور چونکہ ان معنوں میں متعدد خالق ہو سکتے ہیں اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ تمام خالقوں میں بہترین ہے۔ [1]

---

[1] تفصیلات کے لیے جامعہ تعلیمات اسلامی کی کتاب "فلسفہ ولایت" ملاحظہ فرمائیں۔

انفاق کو ۷۰۰ دانوں والی گندم سے کیوں تشبیہ دیگئی ہے؟

سوال: سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

"جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کرنے کی مثال ایک دانے کی ہے جس سے سات بالیاں اگتی ہیں اور ہر بالی میں ایک سو دانے ہوتے ہیں اور اگر اللہ چاہے تو انہیں بڑھا بھی سکتا ہے اور خدا وسعت دینے والا اور دانا ہے۔"

(سورۂ بقرہ - آیت ۲۶۱)

باوجودیکہ ہم نے اکثر کاشتکاروں اور ایسے زرعی سائنسدانوں سے جو علم رکھتے ہیں اور مختلف ممالک کی گندم کی پیداوار کی شرح سے واقف ہیں سوال کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس ایک ایسا قطعۂ زمین ہو جو ہر لحاظ سے تیار ہو اور اسے وقت پر پانی بھی دیا جائے اور پرندے بھی اس کے دانے نہ چگیں اور بیج زمین میں بھی برباد نہ ہو اور اس پر کوئی آفت بھی نازل نہ ہو اور مٹی بھی اعلیٰ قسم کی ہو۔ الغرض جب غلہ بونے کی تمام شرائط پوری ہوتی ہوں تو ایک خروار سے کتنی گندم پیدا ہو سکتی ہے تو انہوں نے جواب دیا ہے کہ ۳۰ یا زیادہ سے زیادہ ۴۰ خروار اور آج

تک یہ نہیں دیکھا گیا کہ کسی زمین نے اس سے زیادہ پیداوار دی ہو۔

پس اس صورت میں خداوند کریم کیسے فرماتا ہے کہ:

"اس دانے کی مانند ہے جو ۷۰۰ گنا پیداوار دیتا ہے بلکہ اگر خدا چاہے تو اس سے بھی زیادہ دیتا ہے؟"

جواب: اس سوال کے جواب میں دو نکتے ذہن میں رکھنے چاہئیں:

اوّل یہ کہ جو آیت اوپر نقل کی گئی ہے اس میں "گندم" یا کسی دوسرے دانے کا نام نہیں لیا گیا بلکہ لفظ "حبۃ" استعمال ہوا ہے جس کے معنی "دانہ" کے ہیں اور یہ کہ سوال کرنے والے نے اس آیت میں "گندم" کا ذکر مثال کے طور پر کیا ہے جو ایک ایسی تشریح ہے جس کا ذکر خود قرآن مجید میں نہیں ہے لہٰذا اگر بیجوں میں سے کوئی ایسا بیج دریافت ہو جائے جس کے ایک دانے سے ۷۰۰ دانے حاصل ہوتے ہوں تو یہ چیز مندرجہ بالا مثال کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے کافی ہوگی۔

اتفاقاً بیجوں کے درمیان کچھ ایسے بھی بیج ہیں ان میں سے ایک مکئی ہے جس کے دانوں کو اگر تیار زمین میں مقررہ فاصلوں پر بویا جائے تو ممکن ہے کہ ایک دانے سے ۷۰۰ دانے (سو سو دانے کی مکئی کی سات بالیاں) یا زیادہ حاصل ہو سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ باجرے کے بیج سے بھی کثیر تعداد میں دانے حاصل ہو سکتے ہیں.....

(تفسیر منہج الصادقین میں اس آیت کے تحت اس جواب کی جانب اشارہ کیا گیا ہے[1])

دوم یہ کہ اگر بالفرض ہم اوپر دیے گئے جواب سے صرفِ نظر بھی کریں تو اس سوال کے حل کی ایک اور راہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب دو چیزوں کو ایک

---

[1] کوئی بعید نہیں کہ بعض اوقات گندم کا ایک دانہ سات سو دانوں میں تبدیل ہو جائے۔ یہ امر دلچسپی کا موجب ہے کہ کچھ عرصہ قبل جرائد نے لکھا تھا کہ کچھ ساحلی مقامات پر گندم کی ایک بالی سے چار ہزار سے زیادہ دانے حاصل ہوئے ہیں۔

دوسری سے تشبیہ دی جاتی ہے تو "مشبہ" کے لیے ایک ایسا امتیاز روا رکھا جاتا ہے جو "مشبہ بہ" میں نہیں ہوتا اگرچہ اصل موضوع کے لحاظ سے وہ آپس میں مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ: "اسکا چہرہ چاند کی اس ٹکیہ کی مانند ہے جسے زوال نہیں یا وہ ایسا سورج ہے جو غروب نہیں ہوتا" یا یہ کہ "اس کا قد سروِ خراماں کی مانند ہے" حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ چاند کو ہمیشہ سے زوال ہوتا ہے اور سورج بھی ہمیشہ غروب ہوتا ہے اور دنیا میں کوئی ایسا سرو موجود نہیں جو چلتا ہو۔ لہٰذا اس قسم کی تشبیہات سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مثلاً اس کا چہرہ چاند کی طرح تر و تازہ اور درخشندہ ہے اور فرق یہ ہے کہ چاند کو زوال ہوتا ہے لیکن اسے زوال نہیں یا اس کا قد سرو کی خوبیاں رکھتا ہے لیکن اُسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ چلتا ہے اور سرو چل نہیں سکتا۔ ادباء کی تحریروں میں اس قسم کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔

شاعرانہ مثالوں کو چھوڑ کر خود قرآن مجید میں بھی ایسی تشبیہیں اور مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً جب قرآن مجید پاکیزہ اور اچھی باتوں کی مثال دیتا ہے تو کہتا ہے:

"وہ ایک ایسے درخت کی مانند ہے جو ہمیشہ پھل دیتا ہے۔" (سورۂ ابراہیم۔ آیت ۲۵)

حالانکہ شاید ایسا درخت جو سارا سال پھل دیتا ہو کہیں موجود نہ ہو یا کم از کم بے حد نادر ہو۔ لہٰذا مراد یہ ہے کہ "پاکیزہ باتوں" کا یہ درخت تمام دوسرے درختوں پر فوقیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے لیے خزاں نہیں اور نہ پھل دینے میں وقت کی کوئی قید ہے۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر نورِ خداوندی کی مثال دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

"وہ ایک ایسے چراغدان کی مانند ہے جس میں چراغ ہو" (سورۂ نور۔ آیت ۳۵)

اور اسی آیت میں آگے چل کر فرماتا ہے:

"نزدیک ہے کہ اس کا تیل (نہایت شفاف اور خالص ہونے سے) آگ کے بغیر روشن ہو جائے۔"

حالانکہ کوئی تیل خواہ وہ کتنا ہی خالص کیوں نہ ہو بغیر آگ کے روشن نہیں

ہوتا۔ درحقیقت یہ ایک امتیاز ہے جس کا ذکر اس سلسلے میں "مشبہ" کے لیے کیا گیا ہے۔ جس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔ اس میں بھی انفاق کے بیج کی پیداوار ۷۰۰ گنا ہو جانا ایک ایسا امتیاز ہے جو "انفاق" کے بیج کو دنیا کے تمام دوسرے بیجوں پر حاصل ہے۔

قرآن میں پسرِ نوح

سوال: حضرت نوحؑ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس امر پہ مامور ہوئے کہ ایک کشتی تیار کریں اور اللہ تعالےٰ نے انہیں خبر دی کہ تمام روئے زمین پر پانی پھیل جائے گا اور کافر غرق ہوجائیں گے لیکن تمہاری عورتیں اور فرزند سلامت رہیں گے۔ حضرت نوحؑ کے فرزندوں میں سے ایک (کنعان) چونکہ بت پرست تھا اس لیے اس نے آپ کی باتوں کی پروا نہ کی اور کشتی میں سوار نہ ہوا۔ آخر کار وہ پانی کی موجوں میں غرق ہوگیا۔ اس دوران میں حضرت نوحؑ نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی اور کہا: "اے پروردگار! تونے وعدہ فرمایا تھا کہ تو میرے اہلبیت میں سے کسی کو ہلاک نہیں کرے گا اور تیرا وعدہ سچا ہے۔" اللہ تعالیٰ نے انہیں مندرجہ ذیل چار جملوں سے مخاطب کیا۔ ان جملوں کا کیا مقصد ہے؟

۱۔ وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے ــــ کیوں؟

۲۔ اس کا عمل غیر صالح ہے ــــ کیوں؟

۳۔ جو کچھ تم نہیں جانتے اس کے بارے میں سوال مت کرو ــــ کیوں؟

۴۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں تاکہ تم جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۴۶)
حضرت نوحؑ کس چیز سے بے خبر تھے ؟

جواب: پہلے جملے "وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے" سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ تمہارا جسمانی فرزند نہیں ہے کیونکہ اس کا حضرت نوحؑ سے جسمانی تعلق اور ان کے صلب سے پیدا ہونا بالکل صحیح تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ تمہارا روحانی اور معنوی فرزند نہیں ہے کیونکہ فرزند کو روحانی اور جسمانی لحاظ سے باپ کی مانند ہونا چاہیے لیکن حضرت نوحؑ کا فرزند ایسا نہیں تھا کیونکہ اس کا اپنے باپ سے روحانی رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

دوسرے جملے سے یہ مراد ہے کہ وہ صالح کردار کا مالک نہیں کیونکہ اس کا کردار اتنا غیر صالح تھا کہ گویا اس کی ذات اور شخصیت عملِ بد اور ناشائستہ کردار کا مجسمہ بن گئی تھی۔

اور تیسرے جملے میں جو کہا گیا ہے کہ تم جو نہیں جانتے اس کے بارے میں سوال مت کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ جن اسرار سے آگاہ نہ ہو ان کے بارے میں رائے زنی نہ کرے۔

اب رہا سوال کا چوتھا حصہ: جس چیز کا حضرت نوحؑ کو علم نہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے آگاہ کیا وہ یہ تھی کہ آپ تصور کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ آپ کے فرزندوں کو غیر مشروط طور پر نجات دے گا لیکن بعد میں انہیں پتا چلا کہ یہ وعدہ فقط ان اشخاص کے بارے میں تھا جنہوں نے اپنا روحانی رابطہ آپ سے منقطع نہیں کیا تھا۔

کیا یہ آیت پیغمبرؐ کے معصوم ہونے سے ہم آہنگ ہے؟

سوال: اگر پیغمبر اسلامؐ اور دوسرے پیغمبرؑ گناہوں سے پاک ہیں تو پھر اس آیت میں پیغمبر کا گناہ بخشنے سے کیا مراد ہے؟

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿١﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٢﴾

"ہم تمہارے لیے نمایاں فتح (فتح مکہ) وجود میں لائے تاکہ خدا تمہارے گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دے اور اپنی نعمت کو تمہارے حق میں کامل کر دے اور تمہیں راہ راست کی جانب ہدایت کرے۔"

(سورۂ فتح - آیت ۱-۲)

جواب: پہلے تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تحریکوں کے بانی اور انقلابی اشخاص جو عام خیالات کے دھارے کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے ترقی پسندانہ پروگرام کے ذریعے روبہ انحطاط اور آلودہ معاشرے کی اصلاح کریں وہ پہلے قدم پر ہی

مخالفتوں، الزام تراشیوں، ناروا نسبتوں اور بے بنیاد تہمتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ تہمت لگانا ان حربوں میں سے ایک ہے جو پسماندہ معاشروں میں استعمال کیے جاتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے مصلح افراد اور شخصیتوں کو فکر کی کوتاہی اور اپنی کم ظرفی کی بنا پر تہمتوں اور ناروا نسبتوں کے زہر آلود تیروں کا نشانہ بنایا جائے۔

پیغمبر اسلامؐ بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ آپ کو بھی قریش کی مخالفت اور بے بنیاد تہمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس شخص کو کل تک قریش کی صادق، امین اور پرہیز گار ہستی مانا جاتا تھا اس نے جس دن اُن کے پست خیالات کی مخالفت کی اور لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دی اسی دن سے اس پر جادوگری، کہانت، جنون اور خدا پر افتراء باندھنے کی تہمتیں لگائی جانے لگیں، اللہ تعالےٰ نے ان تہمتوں کو کفار قریش سے نقل کیا ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اگر ایسی تہمتوں کا کچھ لوگوں پر اثر نہ بھی ہو تب بھی یہ کچھ سادہ لوح اور کم فہم لوگوں کے لیے پیغمبر کی راستگوئی اور دعوے کے بارے میں شک و شبہ کا باعث بنتی ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ لوگوں کا ایک گروہ ایک مدت تک ان تہمتوں کے بارے میں شک، تردّد اور دورائی کا شکار رہتا ہے۔

ان حالات میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان تہمتوں کا ازالہ کیا جائے تاکہ حقیقت کا چہرہ ان اوہام کے گورکھ دھندے کے درمیان میں سے بے نقاب ہو جائے؟

اس کا ایک ہی مؤثر طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ایک اولوالعزم اور ترقی پسند شخص جو اجتماعی طرز فکر اور نصب العین کا علم بردار ہو اگر وہ کامیاب ہو جائے اور اپنا مقصد حاصل کرے اور لوگ خود اپنی آنکھوں سے اس کی تحریک کے فوائد دیکھ لیں تو تمام تہمتیں اور الزام تراشیاں نقش بر آب ہو جاتی ہیں اور ان تہمتوں کی جگہ کئی ایک اچھے القاب لے لیتے ہیں جو عظمت، قدرت اور معنویت کا مظہر ہوتے ہیں اور اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو اکثر یہ تہمتیں بعض لوگوں کے ذہنوں میں مدت تک باقی رہتی ہیں اور کئی اشخاص کے بارے میں کارگر اور مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔

بالکل یہی بات پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ آپ نے ایک

ترقی پسندانہ پروگرام اور کئی ایک ایسے تابناک قوانین کے ساتھ مقابلے کے میدان میں قدم رکھا جو عوام کے لیے تو منفعت بخش تھے لیکن حکومت کے خلاف جاتے تھے۔ آپ اس میدان میں اپنی آئندہ کامیابیوں کی خبر دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کی روشنی میں اور اپنی اور اپنے وفادار ساتھیوں کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کی بدولت آپ نے تمام مشکلات پر قابو پا لیا۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ شرک کا گڑھ اور ان الزام تراشیوں کی پیدائش کا مرکز مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور مکہ ایک درخشاں کامیابی کے طور پر فتح ہوگیا۔

یہ کامیابی جو اس امر کا سبب بنی کہ قریش اپنی تمام قوت کے ساتھ اسلام کے زیرِ حکومت اور اس کے قبضے میں آجائیں، اپنے دامن میں ایک اس سے بھی بڑا نتیجہ رکھتی تھی اور وہ یہ کہ جب یہ مردِ جری اس میدان میں سرخرو ہوگیا اور لوگوں نے اس کی جدوجہد کا بہترین نتیجہ واضح طور پر دیکھ لیا اور اس نے اپنے معنوی انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تو اس کامیابی کی روشنی میں دروغ گووں اور جھوٹی تہمتیں لگانے والوں کے منہ بند ہوگئے اس عظیم کامیابی کی موجودگی میں وہ اسے مجنوں اور دیوانہ یا ساحر اور کاہن نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ وہ شخص جس میں اس قسم کے روحانی اور نفسیاتی نقائص موجود ہوں ایسا انقلاب برپا نہیں کرسکتا۔

لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں "ذنب" سے مراد وہی ناجائز تہمتیں ہیں جو فتح مکہ سے پہلے تک قریش کے سادہ لوح افراد کے دلوں میں موجود تھیں اور اس کامیابی نے ان تمام ناروا نسبتوں کو باطل کردیا اور دنیا کے اس عظیم نجات دہندہ کے مقدس دامن سے یہ بہتان دور ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہی صورتِ حال باقی رہتی جو فتح مکہ سے پہلے تھی اور رسولِ اکرمؐ مقابلے کے میدان میں کامیابی حاصل نہ کرپاتے تو تہمتیں بھی اپنی جگہ قائم رہتیں۔

اس تفسیر کی گواہی دو چیزیں دیتی ہیں:-

۱۔ صریح طور پر آیت یہ کہتی ہے کہ ہم فتح مکہ وجود میں لائے تاکہ اس کی روشنی میں تمہارے گناہ بخش دیے جائیں۔

اگر گناہوں کی بخشش سے مراد تہمتوں اور ناجائز الزام تراشیوں کا باطل کرنا ہی ہو جیسا کہ ہم نے اوپر بالتفصیل بیان کیا ہے تو پھر ان دو چیزوں یعنی "فتح مکہ" اور "گناہوں کی بخشش" کا ارتباط صحیح اور واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اس کامیابی نے تہمتوں کی تکرار کے بارے میں لوگوں کے منہ بند کر دیے اور پھر کسی کے آنحضرتؐ کو الزام دینے کا سوال باقی نہ رہا اور اگر ان سے مراد شرعی گناہ اور نافرمانیاں ہوں تو پھر ان گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ایک عسکری فتح اور ظاہری کامیابی نہیں بلکہ استغفار اور توبہ ہے۔

۲۔ آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ یہ فتح اور کامیابی گزشتہ اور آئندہ گناہوں کی بخشش کے اسباب وجود میں لائی اور یہ جملہ اسی صورت میں صحیح معنوں کا حامل ہو سکتا ہے جب اس سے مراد تہمتیں اور ناروا نسبتیں ہی ہوں یعنی یہ عظیم اجتماعی کامیابی اس امر کا موجب بنی کہ سابقہ تہمتیں زائل ہو جائیں اور آئندہ بھی کوئی ایسی تہمتیں نہ لگائے لیکن اگر اس سے مراد شرعی گناہ ہی ہوں تو پھر آئندہ گناہوں کی بخشش کا صحیح مفہوم برآمد نہیں ہوتا۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کے کیا معنی ہیں؟

سوال: کیا انسان کی روح فنا ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر آپ فرمائیں کہ مجرد ہے اور فنا نہیں ہوتی تو یہ جواب آیۂ شریفہ "خدا کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے"[1] سے کیونکر ہم آہنگ ہے؟

جواب: یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آیۂ شریفہ میں "ھلاک" نابود ہونے اور مکمل طور پر فنا ہو جانے کے معنی میں نہیں آیا کیونکہ نہ صرف انسان کی روح بلکہ اس کا جسم بھی مکمل طور پر نابود نہیں ہوتا اور ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد مٹی میں اور اس دنیا کی دوسری موجودات میں باقی رہتا ہے اور قیامت کے دن وہاں سے اٹھایا جائے گا۔

چنانچہ ہم روح کو مجرد سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ فانیٔ مطلق اور نابود محض ہرگز نہیں ہوتی، اور نہ ہی انسان کا جسم فانیٔ مطلق یا نابود محض ہوتا ہے بلکہ آیۂ شریفہ میں "ہلاک" سے

---

[1] سورۃ قصص - آیت ۸۸

مراد اجزاء کی ترکیب کا درہم برہم ہونا اور صورت کا فنا ہوجانا ہے۔ لہٰذا انسان کا فنا اور ہلاک ہونا یہی ہے کہ روح اور جسم کے مابین رابطہ منقطع ہو جائے اور سابقہ وضع درہم برہم ہو جائے اگرچہ روح اور جسم ہر دو کسی دوسری حالت میں باقی رہیں۔

بہت سی آیات جو گزشتہ اقوام کی ہلاکت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، مندرجہ بالا مطلب پر گواہی دیتی ہیں مثلاً:

"اللہ تعالےٰ نے پہلی قوم عاد اور ثمود کو ہلاک کیا اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ اسی طرح اس نے ان سے پہلے قوم نوحؑ کو ہلاک کیا۔"[1]

ظاہر ہے کہ ان آیات میں عاد اور ثمود اور نوحؑ کی اقوام کی ہلاکت سے مراد ان کا مر جانا اور ان کے جسم و جان کا رابطہ منقطع ہونا ہی ہے۔ لہٰذا آیۂ شریفہ "اللہ تعالےٰ کی ذات کے علاوہ ہر چیز ہلاک اور فنا ہونے والی ہے" کا مطلب یہی ہے کہ دنیا کے تمام موجودات ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور ان کی وضع دگرگوں ہو جاتی ہے اور یہ فقط اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی ہے جو ہر قسم کے تغیّر و تبدل سے مبرّا ہے۔

---

[1] سورۂ نجم۔ آیت ۵۱

حضرت یوسفؑ نے اس بات کی اجازت کیونکر دی کہ ان کے بھائی پر تہمت لگائی جائے؟

سوال: جب حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کو مصر کی مملکت میں روک لینا چاہا تو انہوں نے خود ایک قیمتی سرکاری پیمانہ اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا۔ پھر ایک شخص نے قافلے میں جا کر آواز لگائی:

"اے قافلے والو! تم چور ہو!"

حضرت یوسفؑ نے قیمتی برتن اپنے بھائی کے سامان میں رکھنے کا یہ انداز کیوں اختیار کیا اور کیوں اس امر کا باعث بنے کہ فلسطین کے قافلے پر جو حضرت یوسفؑ کے بھائیوں پر مشتمل تھا بلاوجہ چوری کا الزام لگے جبکہ لوگوں پر افتراء باندھنا اور تہمت لگانا گناہ ہے اور حرام ہے؟

جواب: جس آیت میں داستان کا یہ حصہ بیان کیا گیا ہے وہ یوں ہے:

"جب یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کا سامان تیار کرا دیا تو ایک قیمتی پیمانہ اپنے بھائی کے سامان میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے

ندا دی کہ اے قافلے والو! تم چور ہو" [1]

اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ پیمانہ تو اپنے بھائی کے سامان میں حضرت یوسفؑ نے رکھا لیکن قافلے والوں سے چوری کسی اور شخص نے منسوب کی اور قابلِ توجہ نکتہ یہی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کام کیوں کیا؟ جیسا کہ ۷۶ ویں آیت سے پتا چلتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس اپنے بھائی کو روکنے کا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ نہ تو اس قحط سالی کے زمانے میں مصر کے قوانین اس بات کی اجازت دیتے تھے کہ ایک شخص کو بلاوجہ مصر میں روک رکھا جائے اور نہ ہی آپ کے دوسرے بھائی اس بات پر راضی تھے کہ آپ کا وہ بھائی مصر میں رہ جائے اور جیسا کہ بہت سے مفسرین نے لکھا ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ نے یہ بات اپنے بھائی کو بتادی تھی اور جیسا کہ ۶۹ ویں آیت بتاتی ہے آپ نے ایک محرمانہ اور خصوصی ملاقات میں اپنا تعارف بھی بھائی سے کرا دیا تھا اور ہو سکتا ہے کہ اسے اس تجویز سے بھی آگاہ کر دیا ہو۔ لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کے نقطۂ نظر سے اس معاملے میں کوئی دقت نہیں تھی کیونکہ آپ کے بھائی نے بھی اس تجویز پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کو متہم نہیں کیا۔ انھوں نے نہ تو جھوٹ بولا اور نہ کوئی تہمت لگائی بلکہ سرکاری عہدہ داروں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ چوری ہو گئی ہے سامان کی جانچ پڑتال کی اور یوسفؑ کے بھائی پر الزام لگایا اور اسے روک لیا۔ چونکہ حضرت یوسفؑ کے بھائی کو پہلے سے تجویز کا علم تھا اس لیے وہ خاموش رہا۔ علاوہ ازیں آیت سے اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہ واقعہ حضرت یوسفؑ کے روبرو پیش آیا۔

---

[1] سورۂ یوسف۔ آیت ۷۰

کیا کم ہنسنا اور زیادہ رونا چاہیے؟

سوال: آیۂ شریفہ "انہیں کم ہنسنا اور زیادہ رونا چاہیے" [1] کا کیا مقصد ہے؟
کیا اس کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ تعالےٰ اس آیت میں لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں حالانکہ زیادہ رونا ایسے نقصانات کا حامل ہے جن پر شارع مقدس اسلام یقینی طور پر راضی نہیں ہیں۔ دوسری طرف جب کہ ہنسنا مسرت کا موجب ہے اور جسم و روح کو فرحت بخشتا ہے تو پھر اس سے اجتناب کیوں برتا جائے؟

جواب: جن لوگوں نے آیۂ شریفہ کے یہ معنی کیے ہیں درحقیقت انہوں نے اس کے سیاق و سباق پر توجہ نہیں دی۔ مندرجہ بالا آیت سورۂ توبہ کی ان آیات میں سے ہے جن میں منافقوں اور عہد شکنوں اور اسلامی جہاد کے احکام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور اس سے پہلے یہ آیت ہے:

---

[1] سورۂ توبہ۔ آیت ۸۲

"عہد شکن رسولِ خدا سے مخالفت کر کے خوش ہوئے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے مال اور جان سے خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کہنے لگے کہ اس گرمی کے موسم میں میدان جنگ میں نہ جاؤ۔ انہیں کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ جھلسانے والی ہے بشرطیکہ تم توجہ دو۔" [1]

اس کے فوراً بعد یہ آیت نازل فرمائی ہے:

"چونکہ ایسا ہے اس لیے منافقوں اور جہاد سے اختلاف کرنے والوں کو چاہیے کہ جو کام انہوں نے انجام دیا ہے اس کی سزا کے طور پر کم ہنسیں اور زیادہ روئیں۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۸۲)

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ اس آیت کا آخری حصہ اور پہلے اور بعد کی آیات اور اسی طرح جملہ "فلیضحکوا" کی کلمۂ "فا" سے ابتدا جو اس آیت کو اس سے پچھلی آیت کی فرع ظاہر کرنے کے لیے ہے سب اس بات کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں کہ اس آیت کا تعلق منافقوں اور عہد شکنوں کی وضع اور جہاد کے احکام سے ہے اور اس میں عام لوگوں کے لیے کوئی حکم نہیں ہے اور جو آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ: "یہ عمل — یعنی زیادہ رونا اور کم ہنسنا — ان کے کاموں کی سزا کے طور پر ہے" وہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر انہیں معلوم ہو کہ انہیں کیا کیا سزائیں ملیں گی تو وہ کم ہنسیں گے اور زیادہ روئیں گے اور انہیں غم و اندوہ سے ایک لمحے کے لیے بھی آرام میسّر نہ ہو گا۔

---

[1] سورۂ توبہ۔ آیت ۸۱

یومِ حشر سوال ہوگا یا نہیں ؟

سوال: سورۂ رحمٰن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"قیامت کے دن کسی کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا" [1]

حالانکہ متعدد دوسری آیات میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اس دن گنہگاروں سے سوال ہوگا۔

جواب: جیسا کہ اس سورے کی اس سے اگلی آیات گواہی دیتی ہیں کہ اس مقام پر گنہگاروں سے سوال نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان سے زبانی سوال نہیں ہوگا تاکہ وہ اس دنیا کی طرح اس کا جواب اپنی "زبان" سے دیں بلکہ ان کے اعمال کا اظہار ان کے چہروں سے ہی ہو جائے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں اور بدن کے دوسرے اعضاء ان کے تمام اعمال و اقوال کے بارے میں

---

[1] سورۂ رحمٰن - آیت ۳۹

بتائیں گے۔

اسی سورے میں اس آیت کے بعد کی دو آیتوں میں ارشاد ہوا ہے:

"گنہگاروں کو ان کے چہروں سے پہچان لیا جائے گا۔"

سورۂ یٰسین میں بھی فرمایا گیا ہے کہ:

"آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگاتے ہیں اور ان کی بات کرنے کی قوت سلب کرتے ہیں لیکن انہوں نے جو کچھ انجام دیا ہے ان کے ہاتھ اور پاؤں اس کی گواہی دیں گے۔"[1]

لہٰذا اگر زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "سوال نہیں ہوگا" تو اس سے یہ مراد ہے کہ زبانی سوال نہیں ہوگا لیکن دوسرے گواہ یعنی اعضائے بدن سوالات کے جواب دیں گے۔

---

[1] سورۂ یٰسین - آیت ۶۵

کیا پیغمبر بھی مشورہ کرتا ہے؟

سوال: جب رسولِ اکرمؐ بذریعۂ وحی خداوندِ عالم سے رابطہ رکھتے تھے تو انہیں کیا ضرورت تھی کہ جنگی یا اجتماعی امور میں اپنے اصحاب سے مشورہ کریں۔ اللہ نے سورۂ شوریٰ کی ۳۸ ویں آیت میں انہیں حکم دیا کہ اس کے مطابق ان امور میں ان کے لیے صلاح و مشورہ کرنا ضروری ہے؟ جب آپ فہم و فراست، علم و حکمت اور سیاست میں برترین خلائق تھے تو اس کے باوجود خدا نے انہیں مشورہ کرنے کا حکم کیوں دیا ہے؟

جواب: اس قسم کے سوالات کا جواب قرآن مجید نے دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"پیغمبرؐ کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔" (سورۂ احزاب۔ آیت ۲۱)

لہٰذا مشاورت کا مقصد تعلیم و تربیت تھا اور آنحضرتؐ اپنے اصحاب سے مشورہ کر کے انہیں عملی درس دیتے تھے تاکہ آپ کے بعد وہ مشکل معاملات کے سلسلے میں مل بیٹھیں اور صلاح و مشورہ کر کے اجتماعی مشکلات اور پیچیدہ امور کا حل تلاش کریں۔ اندریں صورت کہ قوم کا بزرگ معارف،

علوم، سیاست اور تدبر میں بلند مقام رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مشورے سے بے نیاز نہ سمجھے اور مشکلات کے حل کے لیے اپنے مخلص رفقا کے خیالات سے فائدہ اٹھائے تو اس کے دین کے پیروؤں کے لیے لازم ہے کہ اس کے اس عمل کو مشعلِ راہ بنائیں اور مشکلات کے حل کے لیے یہی طریقہ اختیار کریں اور من مانے فیصلے نہ کریں۔ (ظاہر ہے کہ صلاح و مشورہ فقط ان معاملات میں کرنا چاہیے جن کے بارے میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے کوئی قطعی حکم نازل نہ ہوا ہو)۔

صغیرہ اور کبیرہ گناہ کیا ہیں ؟

سوال: صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں تمیز کیونکر کی جاسکتی ہے ؟

جواب: درحقیقت صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے تعین کا سرچشمہ قرآن مجید کی آیات ہیں جن میں سے ایک آیت "اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ" [1] (اگر تم کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرو تو ہم تمہارے صغیرہ گناہوں سے درگزر کریں گے) ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی گناہ کے چھوٹا یا بڑا ہونے کا معیار کیا ہے ؟

ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ ہر گناہ خواہ وہ کبیرہ ہو یا صغیرہ چونکہ خدائے تعالیٰ کی نافرمانی ہے اس لیے اپنی ذات کی حد تک بڑا گناہ ہے۔

لیکن کسی گناہ کے چھوٹا یا بڑا ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ اسے خدائے تعالیٰ کی بارگاہِ اقدس کی نسبت سے جانچا جائے کیونکہ ایسی جانچ پڑتال کی رو سے وہ سب کبیرہ

---

[1] سورۂ نساء۔ آیت ۳۱

ہیں۔ تاہم یہ تقسیم گناہوں کے ایک زمرے کو دوسرے زمرے کے مقابل رکھ کر کی گئی ہے۔ اس کے مطابق گناہوں کی دو قسمیں ہیں، یعنی گناہان کبیرہ اور گناہان صغیرہ۔

اب دیکھنا چاہیے کہ کبیرہ کو صغیرہ سے جدا کرنے کا معیار کیا ہے؟

ان دو قسم کے گناہوں کی ایک دوسرے سے علیحدہ شناخت کرنے کے کئی طریقے ہیں اور ان میں سے علماء کے درمیان سب سے مشہور طریقہ یہ ہے کہ ہر وہ گناہ جس کے ارتکاب کے بدلے میں قرآن مجید اور روایات میں عذاب کا وعدہ کیا گیا ہو کبیرہ گناہ ہے مثلاً "کسی انسان کا قتل" جس کے بارے میں قرآن مجید یوں ارشاد فرماتا ہے:

"جو شخص ایک مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے اس کی سزا دوزخ ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔"[1]

بعض علماء نے ایک اور شرط کا اضافہ بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں گناہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس کے ارتکاب کے لیے عذاب کا وعدہ کیا گیا ہو یا کم از کم اس سے تاکیداً منع کیا گیا ہو کیونکہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جن کے ارتکاب پر عذاب کا وعدہ تو نہیں کیا گیا لیکن تاکیداً بار بار منع کر کے ان کے ارتکاب سے روکا گیا ہے۔

مثلاً اگر ہم فرض کریں کہ سود کے بارے میں فقط یہی جملہ نازل ہوا ہے کہ:۔ "سود خور خدا کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں"[2] تو محض یہی جملہ سود خواری کے گناہ کبیرہ ہونے کی نشانی ہے اور اگر دوسری آیات اور روایات میں سود خواروں کو عذاب کا وعدہ نہ دیا جاتا تب بھی سود خواری کی تاکیدی ممانعت اور شدید بندش اس کے بڑا گناہ شمار ہونے کی علامت ہوتی۔ اس لحاظ سے گناہوں کا بڑا یا چھوٹا ہونا کوئی "نسبتی" چیز نہیں ہے بلکہ ان دونوں کی حدیں الگ الگ ہیں اور یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ایک گناہ صغیرہ بھی ہو اور کبیرہ بھی ہو کیونکہ اگر اس کے لیے عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے یا اسکے ارتکاب سے تاکیداً منع کیا گیا ہے تو وہ کبیرہ ہوگا ورنہ صغیرہ ہوگا۔

---

[1] سورۂ نساء - آیت ۹۳ [2] سورۂ بقرہ - آیت ۲۷۹

کیا گناہوں کا کبیرہ اور صغیرہ ہونا نسبتی ہے؟

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک گناہ کا صغیرہ اور کبیرہ ہونا نسبتی ہے یعنی ایک گناہ ممکن ہے کبیرہ ہو لیکن ایک اور گناہ کی نسبت صغیرہ شمار کیا جائے مثلاً چوری جو ایک بڑا گناہ ہے لیکن قتل عمد کی نسبت سے چھوٹا گنا جاتا ہے۔

صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے نسبتی ہونے کی رو سے تمام گناہ معافی اور بخشش کے قابل ہیں کیونکہ قرآن مجید فرماتا ہے:

"اگر تم بڑے گناہوں سے پرہیز کرو تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں سے درگزر کریں گے۔"[1]

لہٰذا ہر گناہ کہ جس سے نسبتاً بڑے گناہ سے پرہیز کیا جائے بخشا جائے گا لیکن شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں کہ جس سے اجتناب برتنے کی صورت میں گناہ شرک بخش دیا جائے۔

---

[1] سورۂ نساء - آیت ۳۱

اس بنا پر جس شخص نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیا ہو اس کے تمام گناہ بخشے جائیں گے۔

جواب: اس سے پہلے سوال کے جواب سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا ہے کیونکہ جیسے کہ کہا گیا ہے گناہوں کی صغیرہ اور کبیرہ میں تقسیم ایک واقعی تقسیم ہے جو اس حساب کی رو سے جس کا ذکر کیا گیا ہے دو قسموں میں تقسیم کیے گئے ہیں اور نسبتی ہونے اور ایک دوسرے پر قیاس کی بنیاد پر ہرگز تقسیم نہیں ہوئے اور مندرجہ بالا آیت اسی بنیاد پر ہم سے گفتگو کرتی ہے اور نتیجہ اس آیت سے یہ برآمد ہوتا ہے کہ جب مسلمان گناہوں کے اس زمرے سے پرہیز کریں جو کبیرہ کہلاتے ہیں تو ان کے دوسرے زمرے کے گناہ جو "سیئات" یا "صغائر" یعنی صغیرہ کہلاتے ہیں بخش دیے جائیں گے اور گناہوں کے ان دو دستوں کی دو مختلف حدیں ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی صف میں وارد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کبیرہ گناہوں سے اجتناب دوسرے کبیرہ گناہوں کی بخشش کا نہیں بلکہ صرف صغیرہ گناہوں کی بخشش کا موجب بن سکتا ہے (ضمناً یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ صغیرہ گناہوں کی تکرار کرنے سے وہ کبیرہ بن جاتے ہیں)۔

کبیرہ گناہ کتنے ہیں؟

سوال: کبیرہ گناہ کتنے ہیں؟

جواب: کبیرہ گناہوں کی شناخت کے لیے مختلف طریقے موجود ہیں اور ہم ان میں سے دو طریقوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

۱- ہر وہ عمل جس کے مرتکب ہوتے والوں کو خدائے تعالےٰ نے قرآن مجید میں سزا اور عذاب کی دھمکی دی ہے (خواہ وہ صریح اور آشکار ہو یا بطور اشارہ یا تاکید کے ساتھ بار بار منع کرنے کی شکل میں ہو) گناہ کبیرہ ہے۔

۲- ان صحیح اور معتبر روایات کے ذریعے جو اسلام کے بزرگ پیشواؤں سے ہم تک پہنچی ہیں اور جن میں کبیرہ گناہ واضح طور پر گنوائے گئے ہیں۔ مثلاً امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام نے جو خط عباسی خلیفہ مامون کو لکھا تھا اس میں کبیرہ گناہوں کی تعداد بیان فرمائی ہے اور اسی طرح "اعمش" نے جو روایت حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل کی ہے اس میں بہت سے کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے اور یہی صورت دوسری روایات کی ہے۔

اب ہم کبیرہ گناہوں کے ایک بہت بڑے حصے کی جانب اشارہ کرتے ہیں جن کا ذکر آیات یا روایات میں آیا ہے اور پروردگار عالم سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ ہم سب کو ان سب گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۱) قتل نفس (۲) زنا کرنا (۳) شراب نوشی (۴) نماز کا ترک کرنا (۵) یتیم کا مال غصب کرنا (۶) میدانِ جہاد سے بھاگ جانا (۷) سود خوری (۸) قمار بازی (۹) ہر قسم کی ستمگری (۱۰) اغلام (۱۱) ظالموں کی مدد کرنا (۱۲) ظالم پر تکیہ کرنا (۱۳) لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں غفلت برتنا (۱۴) اولیائے اللہ سے جنگ (۱۵) جھوٹ (۱۶) خیانت (۱۷) والدین کو آزار دینا (۱۸) پاک دامن لوگوں پر تہمت لگانا (۱۹) غیبت (۲۰) خدائے تعالٰے کے غضب اور سزا سے بے اعتنائی برتنا (۲۱) فریضۂ حج کے بارے میں بے اعتنائی برتنا (۲۲) اسراف اور تبذیر (۲۳) سوّر کا گوشت کھانا (۲۴) خون پینا (۲۵) مردے کا گوشت کھانا (۲۶) ایسے حیوان کا گوشت کھانا جسے خدا کا نام لیے بغیر ذبح کیا گیا ہو (۲۷) خدا کی رحمت سے ناامید ہونا (۲۸) کم تولنا یا ناپنا (۲۹) صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنا (۳۰) قطع رحم (۳۱) زکات کی ادائیگی کا ترک کرنا (۳۲) عہد شکنی (۳۳) گواہی کا چھپانا اور (۳۵) جھوٹی قسم کھانا۔

جو گناہ اوپر گنوائے گئے ہیں وہ کبیرہ گناہوں کا بہت بڑا حصّہ ہیں اگرچہ بہت سے علماء کے نظریے کے مطابق ان کی تعداد انہیں تک محدود نہیں ہے۔

دروغِ مصلحت آمیز کیا چیز ہے؟

سوال: دروغِ مصلحت آمیز کے بارے میں اسلام میں کیا حکم ہے اور کیا پیغبروں اور بزرگ پیشواؤں نے کبھی ایسا جھوٹ بولا ہے؟

جواب: جھوٹ اپنی اصلیت کے اعتبار سے ایک بہت برا فعل ہے اور ہماری موجودہ دور کی بہت سی مشکلوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کا موجب یہی چیز ہے۔ ائمہؑ اہلبیت علیہم السلام کے بعض ارشادات جو ہم تک پہنچے ہیں ان میں جھوٹ کو تمام گناہوں کی کنجی شمار کیا گیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود بعض استثنائی صورتوں میں کچھ ایسے مواقع پیدا ہوجاتے ہیں کہ اگر انسان وہاں سچ بولے تو بہت بڑا فتنہ اور فساد برپا ہوجاتا ہے جب کہ اگر سچ نہ کہے تو فتنہ و فساد کی آگ ٹھنڈی پڑجاتی ہے مثلاً جب دو افراد کے مابین شدید اختلاف ہو اور ان میں سے ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی کرے اور ہم بھی سن رہے ہوں اور یہ جانتے ہوں کہ جو سوالات ہم سے کیے جارہے ہیں اگر ان کا سچ سچ جواب دیں اور اس شخص کی بدگوئی ظاہر کردیں تو فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے گی اور ممکن ہے کہ اس

کے نتیجے میں بہت بڑا نقصان ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر سچ بولنا غلط ہو گا اور کوئی عقلمند شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان حالات میں بھی سچ ہی بولنا چاہیے۔ یہ ایک مانا ہوا عقلی قانون ہے کہ جب کسی چیز کی خرابی اس کی اچھائی سے زیادہ ہو تو ہمیں اس چیز سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اسلامی قوانین بھی اس عقلی حکم کی تائید کرتے ہیں اور ایسے استثنائی حالات میں "ضرورت" کی بناء پر جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں۔

تاہم اس سلسلے میں دو نکات پر بالخصوص توجہ دینی چاہیے۔ اول یہ کہ یہ موضوع مکمل طور پر استثنائی پہلو رکھتا ہے اور مقررہ شرائط کی موجودگی کے علاوہ جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے اور یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ "دروغ مصلحت آمیز" کی آڑ لے کر کسی معقول وجہ کے بغیر یا ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولیں اور یہ کہہ کر اس مذموم فعل کے مرتکب ہوں کہ مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہے۔

دوم یہ کہ اسلام جھوٹ کے موضوع کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ اس صورت میں بھی جب ضرورت کا تقاضا ہو کہ انسان جھوٹ بولے اس نے توریہ[1] کا حکم دیا ہے اور ہمارے علماء و فقہاء کے مابین یہ فتویٰ مشہور ہے۔

"توریہ" سے مراد یہ ہے کہ ضرورت کے مواقع پر جھوٹ بولنے کی بجائے ایک ایسا جملہ کہا جائے جس سے سننے والا اپنے گمان کے مطابق مطلب نکالے جب کہ کہنے والے کا مقصد کچھ اور ہو مثلاً کوئی شخص ہم سے پوچھے کہ فلاں شخص نے میرے خلاف ایسی ایسی بری باتیں کہی ہیں اور ہم اس کا جواب نفی میں دیں جب کہ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہو کہ اس نے ان لفظوں میں نہیں کہیں اگرچہ یہی باتیں اس نے دوسرے لفظوں میں کہی ہوں۔ تاہم سننے والا ہمارے "نہیں" کہنے سے یہ سمجھے کہ اس شخص نے اس کے بارے میں کوئی بات کی ہی نہیں۔

---

[1] "توریہ" ("توصیہ" کے وزن پر) سے مراد وہ کلام ہے جو (باقی صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

اور اگر پیشوایانِ دین نے بہ تقاضائے ضرورت یعنی لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور ان کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات اور فتنہ و فساد کی روک تھام کے لیے ایسے کلمات کہے ہوں جو دروغِ مصلحت آمیز پر مبنی ہوں تو یقیناً وہ توریہ کے تحت آتے ہیں جسے جھوٹ شمار نہیں کیا جاتا۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جن مواقع پر انسان کا وظیفہ توریہ یا دروغِ مصلحت آمیز ہو اگر وہ سچ بولے تو گناہ گار ہے اور اس طرح جو فساد پیدا ہو وہ اس کے لیے جوابدہ ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی آیات کی تشریح و تفسیر میں کسی قسم کے دروغِ مصلحت آمیز اور توریہ کا کوئی وجود نہیں یعنی آیات اور احکام الٰہی کے بارے میں اصولاً ایسی ضرورت کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

(صفحہ ۲۴۹ سے آگے) ایک سے زیادہ معنی رکھتا ہو۔ یعنی کہنے والے کے ذہن میں اس کے حقیقی معنی ہوتے ہیں اور سننے والا اپنے طور پر کچھ اور سمجھتا ہے۔

کیا عورت کو جسمانی سزا دینا جائز ہے؟

سوال: کیا یہ درست ہے کہ قرآن مجید میں اجازت دی گئی ہے کہ اگر عورت حقوقِ زناشوئی سے سرتابی کرے تو اسے جسمانی سزا دی جائے؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے عورتوں کے سماجی تحفظ کے لیے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور وہ ان کی گردنوں پر بہت بڑا حق رکھتا ہے حتیٰ کہ مغربی مورخین کے اس گروہ نے جو اسلام کے بارے میں کوئی خوش آئند رائے نہیں رکھتا مثلاً کرین برنٹن "جان کرسٹوفر" اور "رابرٹ لی وولف" نے اپنی کتاب[۱] میں اس بات کا صریحاً اعتراف کیا ہے کہ تحریکِ اسلام نے عورتوں کی حالت بہتر بنانے میں بڑا موثر کردار ادا کیا ہے اور قرآن مجید نے بھی اس بارے میں تاکیدی احکام صادر کیے ہیں جن کے دو نمونے مندرجہ ذیل آیاتِ شریفہ ہیں:

"اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے رہو۔"[۲]

---

[۱] تاریخ تمدن غرب ومبانی آں در شرق۔ [۲] سورۂ نساء۔ آیت ۱۹

"عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔" [۱]

پیشوایان اسلام کے بیانات میں عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی اس قدر تاکید کی گئی ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ "ان کے ساتھ ترشروئی سے بھی پیش نہیں آنا چاہیے۔"

اسی طرح عورتوں کو بھی اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ اپنے شوہروں سے نہایت محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔

جہاں تک ایسی عورتوں کو خفیف جسمانی سزا دینے کا تعلق ہے جو حقوق زناشوئی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوں اس بارے میں قرآن مجید کا صریح حکم یہ ہے کہ شوہر پہلے پند و نصیحت سے کام لے اور پھر اپنا بستر جدا کرے اور تعلقات معطل کر دے۔ تاہم اگر ان میں سے کوئی بھی عمل مؤثر نہ ہو تو اس صورت میں وہ عورت کو خفیف جسمانی سزا دے سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اقدام ایک خالصتاً استثنائی اقدام ہے اور در حقیقت یہ ایک بیمار شخص کے لیے جراحی کی مانند ہے کہ جس کی خاص مواقع پر ضرورت پڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر شوہر بھی حقوق زناشوئی انجام دینے سے اجتناب برتے اور اسے ان حقوق کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لیے جسمانی سزا کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ ہو تو اسلامی حکومت اسے بدنی سزا دینے کا حق رکھتی ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ ماہرین نفسیات کے نظریے کے مطابق بعض عورتوں میں ہمیشہ آزار خواہی کی کیفیت موجود رہتی ہے اور کبھی کبھی بعض وجوہ کی بنا پر اس میں شدت آجاتی ہے اور یہ نفسیاتی بحران کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی بحرانی اور استثنائی صورتوں میں ملائم سزا ان کی روحانی تسکین کا موجب بنتی ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مذکورہ سزا ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ اسکی وجہ سے بدن زخمی ہو جائے یا اس پر سیاہ، نیلے اور سرخ نشان پڑ جائیں۔

---

[۱] سورۂ بقرہ - آیت ۱۸۷

مصنوعی تلقیح اسلام کے نقطۂ نظر سے

سوال: مصنوعی تلقیح کے بارے میں اسلام کا نظریہ کیا ہے؟
(تلقیح سے مراد یہ ہے کہ مرد کا نطفہ خاص وسائل سے عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور وہ جماع کے بغیر اس طریقے سے حاملہ ہو جائے)۔

جواب: نباتات اور حیوانات کے بارے میں مصنوعی تلقیح کی دیرینہ مثالیں موجود ہیں اور بہت سے درختوں اور حیوانوں کو پیوند کے طریقے سے باردار کر دیا جاتا ہے تاہم انسانوں کے بارے میں یہ مصنوعی تلقیح ایک بالکل نئی چیز ہے اور اس کام کا محرک یہ ہے کہ جو لوگ بعض وجوہ کی بنا پر بچے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہوتے لیکن بیویاں ہر لحاظ سے حاملہ ہونے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ ان کے شبستان زندگی کو بچے کے وجود سے روشن کرنے کے لیے اسی مرد یا کسی اور مرد کا نطفہ طبی ذرائع سے عورت کے رحم میں پہنچا دیا جاتا ہے اور اس طریقے سے وہ حاملہ ہو جاتی ہے۔
یہ مسئلہ دنیا کی مجالس قانون سازمیں (مثلاً انگلستان، فرانس، مصر اور دوسرے ممالک کی مجالس قانون سازمیں) زیر بحث رہا۔ انگلستان کے دار العوام نے فیصلہ کیا ہے

کر بڑے بڑے ماہرین قانون کی ایک کمیٹی تشکیل دیجائے تاکہ وہ اس موضوع کے بارے میں مطالعہ کرے۔ فرانس کے طبیبوں نے اس کام کی انجام دہی کو میاں بیوی کی رضامندی پر موقوف سمجھا ہے اور ان کی رضامندی کی صورت میں اسے جائز قرار دیا ہے۔ اٹلی میں پوپ نے ایک فرمان کے ذریعے اسے حرام قرار دیا ہے اور مفتیٔ اعظم مصر نے اسے "تبنیت" سے بھی زیادہ بدتر جانا ہے جو کہ دین اسلام میں ممنوع ہے۔

مصنوعی تلقیح کی دو صورتیں ہیں

پہلی صورت یہ ہے کہ ایک مرد کا نطفہ اسی کی بیوی کے رحم میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ فقہی دلائل کے نقطۂ نگاہ سے ایسی تلقیح میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ دونوں طرف ایک دوسرے کے شرعی اور قانونی ہمسر ہیں اور مرد و عورت صاحب فرزند ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کام جماع کے ذریعے انجام پاتا ہے یا اس کے لیے طبی وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ البتہ مصنوعی تلقیح کا کام انجام دیتے وقت کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے نتیجے میں کسی حرام فعل کا ارتکاب نہ ہو۔ مثلاً کوئی غیر مرد اس کام کو انجام نہ دے بلکہ اس کی ذمہ داری خود شوہر سنبھالے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک غیر مرد کا نطفہ کسی دوسرے شخص کی بیوی کے رحم میں داخل کیا جائے۔ اس قسم کی تلقیح اسلام کی نظر میں (جس نے ازدواج کی بنیاد احتیاط، باریک بینی، دقت اور پرہیزگاری پر استوار کی ہے) مسلمہ طور پر ناجائز ہے اور اسلام کے بزرگ فقہاء کا نظریہ بھی یہی ہے اور کچھ ایسی روایات سے جو ازدواج کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں اس کی تحریم کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں اخلاقی، اجتماعی اور نفسیاتی اصولوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ کام ہرگز صحیح اور مناسب نہیں ہے اور تین لحاظ سے ایسی خرابیوں کا حامل ہے جن کی جانب ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اس قسم کا کام عورت کی رہنمائی جنسی بے راہ روی کی

جانب کرتا ہے کیونکہ یہ آہستہ آہستہ ناجائز تعلقات کا شوق دلاتا ہے۔ وہ اپنے دل میں سوچتی ہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ غیر مرد کا نطفہ اس کے رحم میں مصنوعی تلقیح کے ذریعے داخل ہوتا ہے یا یہ کام غیر شرعی مباشرت کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس عمل کے انجام پانے کے بعد (خواہ یہ شوہر کی رضامندی سے ہی انجام پایا ہو) یہ عورت اکثر غیر شرعی تعلقات قائم کرنے کا اقدام بھی کرتی ہے کیونکہ ایسا کرنے میں اسے شوہر کی جانب سے کوئی کھٹکا نہیں ہوتا اور اگر وہ حاملہ ہو جائے تو بڑی آسانی سے اس کی ذمہ داری مصنوعی تلقیح پر ڈال سکتی ہے جو شوہر کی رضامندی سے انجام پا چکی ہوتی ہے۔

۲۔ اجتماعی مسائل کے نقطۂ نظر سے یہ عمل خاندان کی بنیاد متزلزل کر دیتا ہے اور گھریلو نظام کی بربادی اور نسب کے درہم برہم ہونے کا موجب بنتا ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں ناجائز تعلقات کی ایک خرابی انساب میں اختلاف اور بچوں اور باپوں کے مابین رشتۂ ارتباط کا ختم ہو جانا ہے اور یہ صورت اس قسم کی مصنوعی تلقیح میں واضح طور پر موجود ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ بڑا ہو کر اپنے حقیقی باپ کو نہیں پہچانتا۔

۳۔ بچوں کی تربیت، پرورش اور ان کی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں فطری جذبات اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اس سے غفلت ہرگز نہیں برتنی چاہیے کیونکہ یہ فطری جذبہ ہی ہے جو باپ کو فرزند کی پرورش اور اس کی ضروریات زندگی مہیا کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور یہ انسانی جذبہ اسی وقت ابھرتا ہے جب وہ بچے کو اپنے بدن کا ٹکڑا سمجھے لیکن اگر وہ یہ جانتا ہو کہ بچہ کسی دوسرے کی اولاد ہے تو پھر اس کے لیے بچے کی پرورش کرنے اور اس کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

عورتوں کو حاملہ ہونے سے باز رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

سوال: کیا عورتوں کو حاملہ ہونے سے باز رکھنا اسلامی قوانین کی رو سے جائز ہے؟
جواب: اسلامی احکام میں نسل کو بڑھانے اور افراد کی تعداد میں اضافہ کرنے کی بے حد حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

"شادیاں کرو اور نسل کو بڑھاؤ کیونکہ میں تمہاری تعداد کی کثرت کی بنا پر تمام امتوں کے مقابل فخر کرتا ہوں حتیٰ کہ تمہارے سقط شدہ بچوں کی تعداد کی بنا پر بھی!"

اس موضوع کا مقصد بھی بالکل واضح ہے کیونکہ کسی قوم کی قوت کا سب سے زیادہ دارومدار اس کی تعداد پر ہوتا ہے۔ چھوٹی اور کم تعداد والی قومیں عموماً کمزور اور ناتواں ہوتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ ایک ملک کی آبادی کی کثرت ممکن ہے بعض اوقات غذا اور جائے سکونت کی فراہمی کے سلسلے میں مشکلات پیدا کر دے لیکن اس کے باوجود بھی

کثیر تعداد اس ملک کی قوت اور عظمت کا موجب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی طاقت ور قومیں وہی ہیں جن کی آبادی زیادہ ہے۔ اب رہا مسئلہ غذا کا تو اسے روئے زمین کے غذائی وسیلوں سے استفادہ کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا عورتوں میں استقرار حمل کے عمل کو روکنا بذاتہٖ اسلام کی نظر میں کوئی اچھا کام نہیں ہے (بجز ایسے مواقع کے جب کہ واقعی معاشرتی اور تربیتی مشکلات پیدا ہو جائیں)۔

اس کے باوجود اسلام نے اسے حرام قرار نہیں دیا اور اکثر علمائے اسلام کے فتوٰی کے مطابق طرفین کی رضامندی سے حمل کا روکنا جائز ہے۔ حتیٰ کہ بعض علمائے کرام نے عورت کے رضامند نہ ہونے کے باوجود اسے جائز قرار دیا ہے۔ دراصل اسلام نے مسلمانوں کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا ہے تاکہ اگر عورت کو حاملہ ہونے سے باز رکھنے کی ضرورت پڑے (مثلاً اگر عورت کمزور اور ناتواں ہو یا کوئی اور مشکل درپیش ہو) تو مسلمان اس قانون سے استفادہ کرتے ہوئے حمل کو روکنے کا اقدام کر سکیں۔

تاہم یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب کچھ اس صورت میں جائز ہے کہ نطفہ ٹھہر نہ چکا ہو لیکن اگر نطفہ قرار پا چکا ہو تو اس کا سقط کرنا مسلمہ طور پر حرام ہے یعنی رحم میں نطفے کے ٹھہر جانے کے بعد (خواہ اسے ٹھہرے ہوئے ایک ہی دن گزرا ہو) اس کا ساقط کرنا بالکل ممنوع ہے۔

"نامشروع جنین" کے سقط کے بارے میں کیا حکم ہے

سوال: اگر کوئی شخص ایسا کام انجام دے جس کے نتیجے میں "نامشروع جنین" سقط ہو جائے تو کیا اسے وہی دیت دینی چاہیے جو مشروع جنین کے سقط کے لیے معین کی گئی ہے یا نہیں؟

جواب: جنین خواہ مشروع طریقے سے وجود میں آئے یا نامشروع طریقے سے اس کا اسقاط قطعاً جائز نہیں ہے اور اس بارے میں مشروع یا نامشروع میں کوئی فرق نہیں۔ جہاں تک نامشروع جنین کے سقط کی دیت کا سوال ہے وہ اس کے باپ اور ماں کو نہیں ملتی (اس صورت میں جب کہ دونوں جماع کی حالت میں اپنے فعل کے نامشروع ہونے کی جانب متوجہ رہے ہوں) اور لاوارث کے ورثے کی طرح بیت المال کا جزو بن جاتی ہے لیکن اگر حلال اور مشروعی جنین کو ساقط کیا جائے تو اس کی دیت اس کے وارثوں کو ملتی ہے۔ بجز اس صورت کے کہ جب وارثوں میں سے کسی نے (مثلاً ماں یا باپ نے) اسے ساقط کرنے کا اقدام کیا ہو کیونکہ ان حالات میں وہ دیت سے اسی طرح محروم ہو جاتا ہے جس طرح قاتل مقتول کے ورثے سے محروم ہو جاتا ہے۔

خون چڑھانا

سوال: آجکل تمام ہسپتالوں میں کئی ایسے لوگوں کو جن میں خون کی کمی ہو یا جن کا آپریشن کیا گیا ہو خون چڑھایا جاتا ہے اور ممکن ہے کہ مرد کا خون ایک نا محرم عورت کے بدن میں داخل کر دیا جائے یا عورت کا خون نا محرم مرد کو چڑھا دیا جائے۔ کیا اسلام کے نقطۂ نگاہ سے اس عمل کے انجام دینے میں کوئی حرج نہیں؟

جواب: چونکہ اس عمل کے ممنوع ہونے کے بارے میں کوئی دلیل دستیاب نہیں ہے لہذا فقہی قواعد کے مطابق اس میں کوئی حرج نہیں۔ تاہم ممکنہ صورت میں اگر مرد کا خون مرد کو اور عورت کا خون عورت کو چڑھا دیا جائے تو بہتر ہے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تب بھی جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ایسا کرنا حرام نہیں ہے۔

کیا خلوص نیت اس عمل سے منافات نہیں رکھتا؟

سوال: فقہائے اسلام فرماتے ہیں:
نماز پڑھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ خلوص نیت رکھتا ہو اور خدا کے فرمان کی اطاعت کے علاوہ کوئی چیز اس فعل کی محرک نہ ہو۔ اس بنا پر جو نماز ریاکاری کے طور پر اور شہرت حاصل کرنے کے لیے پڑھی جائے وہ باطل ہے کیونکہ اس میں خلوصِ نیت کا فقدان ہوتا ہے۔ اسی قاعدے کے مطابق انسان جو نماز دوسرے کے مجبور کرنے پر کراہت سے پڑھے وہ بھی باطل ہے کیونکہ اس کی محرک خدا کے فرمان کی اطاعت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اسلامی ممالک میں لوگوں کو نماز اور وہ بھی جماعت کے ساتھ ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسے اعمال کی کیا نوعیت ہے؟

جواب: ان طولانی بحثوں کو چھوڑ کر جو علمائے اسلام نے عبادات کی ماہیت کے بارے میں کی ہیں اور جن کے مطابق چند بنیادی عبادات میں اکراہ اور اجبار بھی مناسب ہے کہا جاسکتا ہے کہ اصولاً اس قسم کی عبادت کو شروع شروع میں

جبر اور اکراہ کے تحت بجالائی جائے لیکن آہستہ آہستہ جبر و اکراہ کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور اس عمل کو بار بار بجالانے کے بعد اس کی عادت ہو جاتی ہے اور پھر فرمانِ الٰہی کی اطاعت ہی اس کا حقیقی محرک بن جاتی ہے۔ اس صورت میں بالفرض اگر اس نے شروع میں بعض نمازیں جبر و اکراہ کی بنا پر ادا کی ہوں تو وہ باطل ہوں گی لیکن اکراہ کا اثر زائل ہو جانے کے وقت سے جبکہ وہ ایک فرض شناس شخص بن جائیگا اس کے باقی اعمال خلوصِ نیت پر مبنی ہوں گے۔

علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان اشخاص کو اس کے سوا کوئی مجبوری نہیں ہوتی کہ وہ جماعت کی صفوں تک پہنچیں اور مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اس حالت میں یہ اشخاص خود اپنی رغبت سے نماز کی نیت باندھ سکتے ہیں اور نماز با جماعت کی جزا حاصل کر سکتے ہیں۔ ویسے وہ یہ بھی تو کر سکتے ہیں کہ ظاہری طور پر نماز کی صورت اپنائیں اور دوسروں کی طرح رکوع و سجود بجالائیں لیکن در اصل انہوں نے نماز کی نیت نہ کی ہو۔ پس اگر کوئی شخص اس صورت میں نماز کی نیت کرے تو اس کی نماز صحیح ہے کیونکہ اس نے اس کی ادائیگی ارادے اور رغبت سے کی ہے۔

ہم بعض اوقات "عصر" کی نماز ظہر کے وقت کیوں پڑھتے ہیں؟

سوال: ہم بعض اوقات ظہر کی نماز اس کے اول وقت میں ادا کرنے کے بعد عصر کی نماز کیوں بجالاتے ہیں جب کہ وہ عصر کا وقت نہیں ہوتا اور اسی طرح ہم بعض اوقات ظہر کی نماز آخر وقت میں کیوں پڑھتے ہیں جب کہ اس کا وقت گزر چکا ہوتا ہے؟

جواب: بنیادی طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ظہر و عصر کی نمازوں اور اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں میں سے ہر ایک کے "مختص وقت" سے یہ مراد ہے کہ اس نماز کے علاوہ جس سے وہ وقت مخصوص ہو اس وقت میں کوئی اور نماز ادا نہیں کی جا سکتی۔

مثلاً اول ظہر سے لے کر چار رکعت کے برابر کا وقت نماز ظہر کے لیے اور غروب آفتاب سے پہلے چار رکعت کے برابر کا وقت نماز عصر کے لیے مخصوص ہے اور جو وقت ان دونوں کے درمیان ہے وہ "ظہر اور عصر" کا مشترک وقت ہوتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان دونوں نمازوں میں سے ہر ایک کا ایک وقت فضیلت

ہوتا ہے اور اگر انھیں اس وقت میں ادا کیا جائے تو اس کا اجر و ثواب زیادہ ہوتا ہے۔

مثلاً نمازِ ظہر کی فضیلت کا وقت ظہر کی ابتدا سے اس وقت تک ہے جب کہ شاخص کا سایہ خود اس کے برابر ہو جائے۔ اس مقام پر پہنچ کر ظہر کی فضیلت کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر ان دو نمازوں کے نام "ظہر" اور "عصر" ان کے اوقاتِ فضیلت کے پیشِ نظر رکھے گئے ہیں، وقتِ مشترک کی وجہ سے نہیں کہ جس میں یہ دونوں نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں۔

جو شخص نمازِ عصر اوائلِ ظہر میں پڑھے وہ اپنی نماز صحیح وقت میں پڑھتا ہے اور جب وہ نمازِ عصر بجا لانے کی نیت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں وہ نماز پڑھ رہا ہوں جس کا وقت فضیلت کے نقطۂ نگاہ سے وقتِ عصر ہے۔ بہر حال بہتر یہ ہے کہ اس نماز کی ادائیگی میں تاخیر کرے اور اسے عصر کے وقتِ فضیلت میں بجا لائے، اور اسی طرح اگر کوئی شخص نمازِ ظہر دن کے آخر میں بجا لائے تو وہ یہ نماز مشترک وقت میں پڑھتا ہے اور اس کے نمازِ ظہر کی نیت باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا وقتِ فضیلت ظہر ہے اور "مختص وقت"، "مشترک وقت" اور "وقتِ فضیلت" کے لحاظ سے نمازِ مغرب و عشاء کی بھی یہی صورت ہے۔

کیا سب اعمال کے قبول ہونے میں نماز کا دخل ہے؟

سوال: ..... میں نے ایک کتاب میں یہ بات مسلمانوں پر اعتراض کے طور پر لکھی دیکھی ہے:

"مسلمانوں کے علماء نے فقہ اور حدیث کی کتابوں میں تحریر کیا ہے کہ جب تک نماز قبول نہ ہو دوسرے اعمال قبول نہیں ہوں گے اور پھر اسی کتاب میں نماز کے قبول ہونے کی وہ شرائط لکھی ہیں کہ جنہیں ان میں سے کوئی شخص اپنی تمام عمر میں بھی پوری نہیں کر سکتا اور اگر کوئی پوری کر بھی لے تو ایسا شخص شاذ و نادر ہی ہوگا۔ لہٰذا ان کے اپنے ہی بیان کے مطابق ان کے تمام عمر میں کیے گئے اعمال و عبادات قبول نہیں ہوں گے۔"

براہِ مہربانی اس اعتراض کا جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ فقہی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ شرائط اتنی سخت نہیں ہیں کہ کوئی انہیں پورا نہ کر سکے بلکہ بہت سے لوگ اپنے اعمال اور

کردار پر زیادہ توجہ دے کر ان شرائط پر پورے اتر سکتے ہیں۔ کتب عملیہ کا مطالعہ کر کے آپ خود اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں لہٰذا ایسی چیزیں اسلام سے منسوب کرنا ایک ناروا نسبت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں نماز اور دوسرے اعمال کی قبولیت درجے اور مراتب رکھتی ہے یعنی ممکن ہے کہ کوئی عبادت قبولیت کا پہلا درجہ حاصل نہ کر سکے لیکن اس سے نچلے درجوں کی حقدار ہو۔ بنیادی طور پر صحیح عبادت یقیناً قبولیت کا ایک درجہ رکھتی ہے اسی طرح دوسرے اعمال کی قبولیت بھی نماز کی قبولیت کی نسبت سے ہوگی۔

اس قول کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ اگر نماز صحیح ہو اور اسلام کے واضح احکام کے مطابق ادا کی جائے تو وہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوگی اور انسان کا قلب اور روح جتنے پاکیزہ ہوں گے اور وہ ظلم و ستم اور گناہ سے جتنا زیادہ پرہیز کرے گا اس کی قبولیت کا درجہ اتنا ہی بلند ہوگا کیونکہ ہر عمل کی قدر و قیمت اس عمل کے بجالانے والے کی ذہنیت و کیفیت سے وابستہ ہوتی ہے۔

قطبی علاقوں میں نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا عمل کیسے انجام دیا جائے؟

سوال: .... جب ہماری ملاقات بعض مادہ پرستوں اور غیر مسلم افراد سے ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں:

"اسلام ایک آفاقی مذہب کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اس کے احکام فقط ہمارے خطے اور اسی طرح کے دیگر خطوں میں نافذ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہر روز پانچ نمازیں پڑھنے اور رمضان المبارک میں روزے رکھنے کے احکام قطب شمالی اور قطب جنوبی کے نزدیک واقع مقامات پر قابل اجرا نہیں ہیں کیونکہ وہاں راتیں اور دن غیر معمولی طور پر لمبے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض مقامات پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔"

جواب: حکمت الٰہی سے اسلامی شریعت میں ایسے تمام متوقع مسائل کا حل قبل از وقت پیش کیا جا چکا ہے اور ان کے لیے مناسب احکام بھی دے دیے گئے ہیں۔

بنابریں اسلامی قوانین ہر مقام پر اور ہر زمانے میں کسی تفاوت کے بغیر قابلِ اجراء ہیں۔

اس قول کی توضیح یہ ہے کہ: ہمارے بزرگ فقہاء نے اپنی فقہی کتابوں میں جو اسلام کے عملی احکام کی جزئیات سے بحث کرتی ہیں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ مثلاً مرحوم آیت اللہ سید محمد کاظم یزدی نے جو ہمارے بزرگ فقہا میں سے ہیں اپنی کتاب "عروۃ الوثقیٰ" میں بھی مسئلہ پیش کرتے ہوئے اس کے متعلق واضح حکم دیا ہے کہ:

"ایسے اشخاص کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ اپنی نمازیں اور روزے معتدل علاقوں کے اوقات کے مطابق انجام دیں"۔

یعنی ان اشخاص کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ایسے موسم میں معتدل علاقوں میں اوسطاً راتیں اور دن کتنے لمبے ہوتے ہیں اور پھر اس کے مطابق روزے رکھیں اور پنجگانہ نمازیں بجالائیں۔

اس موضوع کی ایک اور طریقے سے بھی توضیح کی جاسکتی ہے جس سے تمام شکوک اور اعتراضات دور ہوجاتے ہیں (غور فرمائیں):

قطبی منطقوں میں جہاں راتیں اور دن لمبے ہوتے ہیں اور بعض اوقات سورج چھ مہینے تک آسمان پر دکھائی دیتا ہے اور غروب نہیں ہوتا وہ (یعنی سورج ہماری نظر میں) ہر چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ افق کے گرد گھومتا ہے۔

ایسے منطقوں میں افق کے گرد سورج کی حرکت ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوتی۔ یعنی چوبیس گھنٹوں میں جب وہ افق کے گرد ایک مرتبہ گھومتا ہے تو کبھی وہ اوپر چلا جاتا ہے اور کبھی نیچے آجاتا ہے اور حضیض میں واقع ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کبھی فضا زیادہ روشن ہوتی ہے اور کبھی کم۔ چنانچہ ہر شب و روز میں یہ کیفیت رونما ہوتی ہے اور اگر آپ وہ تصاویر ملاحظہ فرمائیں جو افق کے گرد سورج کی حرکت کے دوران اس

لہ کتاب صوم۔ طرق ثبوت الہلال مسئلہ ۱۰۔ لہ اہل ہیئت کے نزدیک وہ نقطہ جو "اوج" کے مقابل ہے۔

مقامات سے اتاری گئی ہیں تو یہ حقیقت آپ پر بخوبی واضح ہو جائے گی۔

جب سورج آسمان پر بلند ہوتا ہے تو قطبی منطقوں[1] کے باشندے اسے "دن" کہتے ہیں اور اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب سورج ڈھلتا ہے اور افق کے نزدیک پہنچ کر مدھم پڑ جاتا ہے تو اسے رات کہتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب سورج قطبی منطقوں کے افق میں نیچے چلا جاتا ہے اس وقت معتدلہ منطقوں میں جو اسی نصف النہار پر واقع ہوتے ہیں "حقیقی رات" ہوتی ہے۔

اس حساب کی رُو سے وہاں رات اور دن کا تعین آسان ہو جاتا ہے۔ اگر شاخص کو زمین پر نصب کیا جائے تو جب اس کا سایہ تھوڑے سے تھوڑا رہ جائے اس وقت ظہر اور جب زیادہ سے زیادہ ہو جائے اس وقت آدھی رات ہو گی اور اس طریقے سے ظہر اور آدھی رات کا تعین کرنے میں مشکل حل ہو جاتی ہے۔

اب اگر ہم سال کے اس موقع پر معتدلہ منطقوں کے دنوں اور راتوں کی مقدار سے واقف ہوں مثلاً اگر ہم جانتے ہوں کہ موسم گرما کی ابتدا میں دن اوسطاً ۱۴ گھنٹے کے اور راتیں دس گھنٹے کی ہوتی ہیں تو ہماری پنجگانہ نمازوں اور روزوں کی ذمہ داری بالکل واضح ہو جائے گی (غور فرمائیں)۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسکی بنا پر لمبے دنوں میں نماز اور روزے کی ذمہ داری تو واضح ہو گئی لیکن جب راتیں لمبی ہوں تو یاد رکھنا چاہیے کہ ۲۴ گھنٹوں میں فضا ایک جیسی نہیں ہوتی بلکہ کبھی تاریک اور کبھی قدرے روشن ہوتی ہے کیونکہ بعض اوقات سورج افق کے نزدیک ہو جاتا ہے اور فضا میں دھندلکے جیسی یا اس سے کچھ زیادہ تاریکی ہوتی ہے اور کبھی سورج افق سے دور ہو جاتا ہے اور فضا تاریک ہو جاتی ہے۔[2]

---

[1] قطبی منطقوں سے مراد وہ مقامات ہیں جو ۶۷ درجہ کے مدار سے اوپر واقع ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ حصے آباد ہیں اور کچھ سکونت کے قابل نہیں ہیں۔ [2] قطب پر لمبی راتوں (باقی صفحہ ۶۹ پر)

ان راتوں میں ستاروں کی حرکات کی وضع اوران کے افق سے فاصلے اور اسی طرح فضا کی تاریکی اور روشنی کی وضع سے آدھی رات اور ظہر کا تعین کیا جاسکتا ہے اور معتدلہ منطقوں کی راتوں اور دنوں کی متوسط مقدار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شرعی وظائف بجالائے جاسکتے ہیں۔

مندرجہ بالا وضاحتوں سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ نماز اور روزے کے وظائف سمیت اسلام کے احکام کسی معین خطے کے لیے مخصوص نہیں اور تمام منطقوں میں ان پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

(صفحہ ۲۶۸ سے آگے) اور لمبے دنوں میں کیفیات کی ان تبدیلیوں کی سائنسی وجہ یہ ہے کہ زمین کا محور اس کے مدار پر عمودی شکل میں نہیں اور تقریباً ۲۳ درجے جھکا ہوا ہے۔

اوّل وقت میں نماز

سوال: بعض علماء نے اول وقت میں نماز کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے کہا ہے کہ اس وقت امامِ زمان علیہ السلام نماز پڑھتے ہیں اور جو لوگ اس وقت نماز پڑھتے ہیں ان کی نماز بھی امام علیہ السلام کی نماز کی برکت سے بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہو جائے گی لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اوقات اور افق آپس میں بے حد فرق رکھتے ہیں اور دنیا کے تمام ممالک کا تو ذکر ہی کیا اکثر ایک ملک میں بھی کئی ایک افق موجود ہوتے ہیں۔ اس صورت میں صرف اسی خطے کے افراد کی نماز امام علیہ السلام کی نماز سے مطابقت رکھتی ہے جس خطے میں خود امامؑ نماز پڑھتے ہوں۔ ان کے علاوہ دیگر افراد کی نماز کا وقت امامؑ کی نماز کے مطابق نہیں ہو سکتا۔

اس مسئلہ کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے؟

جواب: جن لوگوں نے اول وقت میں نماز پڑھنے کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کی ہے ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو نمازیں اول وقت میں

پڑھی جائیں ان میں امام علیہ السلام کی نمازیں اول وقت ادائیگی کی قدر مشترک ہوتی ہے کیونکہ آپ بھی اول وقت میں نماز ادا فرماتے ہیں اور اسی قدرِ مشترک کی بدولت دوسروں کی نمازوں کو بھی بارگاہِ الٰہی میں فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ تاہم افقوں کے اختلاف کا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نمازیں ایک واحد وقت میں ادا کی جائیں بلکہ اس کا مدعا "اول وقت میں نماز کی ادائیگی" کے عنوان واحد میں متحد ہونا ہے جو ہر شخص اپنے افق کے مطابق بجا لاتا ہے۔

قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے کا مقصد

سوال: نماز کے وقت قبلہ رو کھڑے ہونا کیوں ضروری ہے جب کہ خدائے تعالیٰ ہر جگہ ہے اور کوئی مخصوص سمت نہیں رکھتا؟

جواب: قبلہ کی جانب منہ کر کے نماز پڑھنا اس وجہ سے نہیں ہے کہ خدائے تعالےٰ کوئی مخصوص جگہ یا سمت رکھتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید نے قبلہ سے متعلق آیات کے سلسلے میں بالخصوص دو مقامات پر اس حقیقت کی وضاحت کی ہے اور فرمایا ہے:

"مشرق اور مغرب خدا کے ہیں۔ تم جس طرف منہ کرو وہیں خدا ہے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۱۵)

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے:

"مشرق اور مغرب خدا کے ہیں اور ہر جگہ اس کے لیے یکساں ہے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۴۲)

نماز میں قبلہ رو کھڑا ہونا اس لیے ہے کہ انسان جسم ہونے کی بنا پر مجبور ہے کہ

نماز کے دوران ایک طرف متوجہ ہو۔ تاہم اسلام چاہتا ہے کہ اس عبادت (نماز) کی تکمیل کے لیے اس صورت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ اللہ تعالیٰ کی پرستش کا قدیم ترین مرکز ہے۔ یہ وہ گھر ہے جس کی بنیاد توحید کے مردِ میدان حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے رکھی اور یہ تمام راہنمایانِ توحید اور پیغمبرانِ الٰہی کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

اس مرکزِ توحید کی جانب توجہ اللہ تعالیٰ کی جانب توجہ کا موجب ہے، یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی مکان نہیں رکھتا۔ تاہم جو شخص ایسے مرکزِ توحید کے سامنے کھڑا ہو وہ تمام حالات کے مقابلے میں خدائے تعالیٰ کی جانب زیادہ متوجہ ہوتا ہے اور گویا اپنے آپ کو بارگاہِ الٰہی میں حاضر دیکھتا ہے۔

اس کے علاوہ دنیا کے مسلمانوں کا بالعموم ہر دن اور رات میں پانچ مرتبہ اس مقدس مرکز کی جانب متوجہ ہونا ان کے دل و جان میں وحدت اور یگانگت کی روح کو پروان چڑھاتا ہے اور وحدتِ اسلامی و اتحادِ ملی کے قیام میں مدد دیتا ہے، چار دانگ عالم میں مقیم مختلف اسلامی جمعیتوں کو باہم مربوط کرتا ہے اور ان کی شوکت و عظمت کو ظاہر کرتا ہے اور بالآخر اسلام کی آفاقی تعلیمات کا جوہر "عقیدے اور نظریے کی وحدت" کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

اگر کرۂ زمین کے باہر سے کوئی دیکھنے والا نماز کے دوران مسلمانوں کی صفوں کی وضع پر نظر ڈالے تو وہ دیکھے گا کہ ان کی تمام صفیں ایسے دائرے تشکیل دیتی ہیں جن کا مرکز ایک ہے اور ان دائروں کے قلب میں خانۂ کعبہ واقع ہے اور یہ مسلمانوں کی وحدت کی جانب ایک اشارہ ہے۔

شطرنج کے کھیل کے بارے میں کیا حکم ہے؟

سوال: کیا دین متین اسلام کے نقطہ نظر سے شطرنج کے کھیل میں کوئی خرابی ہے یا نہیں؟ بلاشبہ آپ جانتے ہیں کہ عموماً شطرنج کے کھیل میں کوئی شرط نہیں لگائی جاتی۔ حتیٰ کہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات یہ کھیل جوئے کی روک تھام کرتا ہے۔ اب اس بات کے پیش نظر آجکل شطرنج کا کھیل ایک ذہنی ورزش سمجھا جاتا ہے اور مسلسل مقبول ہو رہا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سوال کا مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب: ہمارے علماء کے نزدیک یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے کہ جوئے کے آلات کے ساتھ کھیلنا خواہ کوئی شرط نہ بھی لگائی جائے بلاشبہ حرام ہے اور ممکن ہے کہ اس تعین کے پس منظر میں یہ فلسفہ ہو کہ ان آلات سے سروکار رکھنا انسان کو خواہ مخواہ جوئے کی جانب راغب کرتا ہے اور بالخصوص شطرنج کے کھیل کے بارے میں ائمہ علیہم السلام سے متعدد روایات ہم تک پہنچی ہیں، کہ اس کھیل کے آلات کا استعمال ہر طرح سے ممنوع ہے اور اسے

"ذہنی ورزش" کا نام دینے سے شطرنج کی حرمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ ممکن ہے کہ اسی طرح سے ذہنی ورزش کے نام پر دوسری اقسام کا جوا بھی کھیلا جائے چونکہ گنجفہ سمیت جوئے کی بہت سی اقسام ایسی ہیں جن میں ذہنی کاوش کا پہلو موجود ہے لیکن ان کی خرابیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ شطرنج ایک قسم کا جوا ہے جو شروع ہی سے اس مقصد کے لیے اختراع کیا گیا تھا۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوئے کی دو قسمیں ہیں۔

بعض اوقات سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہوتی اور بازی جیتنے کا انحصار محض اتفاق پر ہوتا ہے جب کہ بعض دوسرے کھیلوں میں غور و فکر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ شطرنج ان دوسری قسم کے کھیلوں میں سے ہے۔

علاوہ ازیں شطرنج ایک استعماری کھیل ہے کیونکہ یہ ایک استعماری میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتا ہے جو انسانی زندگی کے تاریک ادوار کی یادگار ہے۔ لہٰذا شطرنج کی خرابیوں میں سے ایک اس کی استعماری نوعیت بھی ہے۔

اس ضمن میں اسلامی آثار و روایات کے مطالعے کے بعد شطرنج کے کھیل کی حرمت کے بارے میں کسی شک یا انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تاہم بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ جب تک دیوار کی دوسری طرف سے (مغرب سے) کوئی بات نہ سن لیں ان کے دل میں نہیں بیٹھتی۔ لہٰذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ یہاں ان مطالب کا ذکر کریں جو ہم نے انہیں دنوں میں ایک فاضل معاصر کی تحریر میں پڑھے ہیں۔ شاید اس کی بدولت شطرنج کے پھیلاؤ کی روک تھام ہو سکے جو بدقسمتی سے ہمارے ملک کے گوشے گوشے میں اس عندیے سے کھیلا جا رہا ہے کہ اس کھیل سے غور و فکر کی قوت بڑھتی ہے۔

یہ گفتگو فرانس کے مشہور شطرنج باز "شاناتال شودہ دوسیلان" کی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: "شطرنج کا عالمی چیمپئن ہونے کا اعزاز شاناتال کے علاوہ کوئی نہیں حاصل کر سکتا۔" اور عالمی پریس میں اور خاص طور پر کھیلوں کے بارے میں روسی مطبوعات میں تمام حریفوں کے مقابل اس کی مہارت اور برتری کی تعریف کی گئی ہے۔

اب اس بارے میں شاناتال کی تحریر پڑھیے :

"یہ ثابت کرنے کے لیے کہ شطرنج ایک تھکا دینے والا کھیل ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ چالیسویں چال چلنے کے بعد اگر کوئی نتیجہ نہ نکلے تو کھیل ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ "ریک یاویک" میں ہوا اور حساب لگایا گیا ہے کہ پہلی چار چالوں میں کل ممکنہ ترکیبات ۳۱۸۹۷۶۵۸۴۰۰۰ اور پہلی دس چالوں میں ۱۶۹۵۱۸۸۲۹۱۰۵۴۴۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ہوتی ہیں۔ پھر وہ ان افراد کا ذکر کرتا ہے جو شطرنج کے چیمپئن ہیں۔ ان کے بارے میں وہ کہتا ہے ممکن ہے کہ شطرنج کے علاوہ دیگر معاملات میں ان کی استعداد اوسط درجے سے بھی کم ہو۔ تاہم میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ شطرنج واقعی خطرناک چیز ہے کیونکہ اس سے دوسرے ذہنی قویٰ اور دماغی صلاحیتیں ناکارہ اور معطل ہو جاتی ہیں۔ لغوی معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ شطرنج خللِ دماغ پیدا کرتا ہے۔"

اس کے بعد شاناتال عظیم چیمپئن "الخیین" کا قول دہراتا ہے جو ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ "جیتنے کے لیے اپنے حریف سے متنفر ہونا چاہیے" اور شطرنج کے دوسرے نقصانات کے علاوہ یہ ایک ناقابلِ انکار اخلاقی نقصان ہے۔[1]

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شطرنج ایک قسم کا جوا ہے اور اس مقام پر ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام نے جوئے کو اس میں کسی چیز کی ہار جیت کی شرط نہ ہونے کی صورت میں بھی کلی طور پر کیوں حرام قرار دیا ہے اس لیے کہ درحقیقت کوئی بھی جوا ہار جیت کی شرط کے بغیر نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب روپیہ جیتنے یا ہارنے کا سوال درمیان میں نہ ہو تو یہ ہار جیت دماغ، اخلاق اور وجود میں ہوتی ہے۔

---

[1] "اولین دانشگاہ و آخرین پیغمبر" مصنفہ ڈاکٹر سید رضا پاک نژاد۔ جلد ۱۷

اخلاقی ضربات

اگر خدا کی یاد زندگی سے حذف ہو جائے اور اگر خدا کی محبت اور عشق یعنی ایمان انسان کے وجود سے مفقود ہو جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے ؟ باقی رہتا ہے وحشیانہ خیالات کے ساتھ ایک بے آرام، مضطرب، خائف، غمگین اور نا امید انسان۔

علم اخلاق کے تمام ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کی حقیقی سعادت اور خوش بختی کا راز اس کے احساسات کے توازن میں پوشیدہ ہے جسے عدالت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس لفظ کے حقیقی معنوں میں اس سے مراد اپنے طرز زندگی کو خدا کے راستے سے منطبق کرنا ہے جو کہ سیدھا راستہ یعنی صراط مستقیم ہے کیونکہ روح کو آرام اور اطمینان یہیں نصیب ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں جو ہمارے پیشواؤں سے نقل کی گئی ہے اس لطیف نکتے کی جانب اشارہ ہوا ہے کہ :

"حقیقی انسان وہی شخص ہے جو ایمان رکھتا ہو"

جُوا ان مختلف عوامل میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے انسان خدا کی یاد بھلا بیٹھتا ہے اور ایمان و عمل سے محروم ہو جاتا ہے۔

امیر المومنینؑ نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو شطرنج کھیلنے میں مشغول تھے۔ آپ نے ان سے وہ جملہ کہا جو بت شکن ابراہیمؑ کہا کرتے تھے :

"یہ بے روح جسمے اور بے اثر بت کیا چیزیں ہیں کہ تم نے اپنے آپ کو ان میں مشغول کر رکھا ہے" [1]

اسلامی مآخذ میں شطرنج کھیلنے، کسی کو یہ کھیل سکھانے اور شطرنج کے سامان کی خرید و فروخت کرنے کی تحریم کے بارے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔

---

[1] مَاهٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۔ (سورۂ انبیاء۔ آیت ۵۲)

لاطینی زبان بولنے والے نماز کیسے پڑھیں؟

سوال: جن ممالک میں لاطینی زبان بولی جاتی ہے اگر وہاں کے لوگ مسلمان ہو جائیں اور نماز و دعا پڑھنا چاہیں تو کیا ان کے لیے عربی الفاظ کا مخصوص عربی تجوید کے ساتھ سیکھنا ممکن ہے؟

جواب: جیسا کہ ہم جانتے ہیں ان میں زیادہ تر لوگ پڑھے لکھے ہیں جن کے لیے عربی میں نماز یا قرآن مجید سیکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے حتیٰ کہ وہ مشرقی علوم سے بہرہ ور ہونے کے لیے اپنی بہت سی یونیورسٹیوں میں عربی زبان سیکھتے ہیں۔ جیسے کہ ہم ان کی زبان سیکھتے وقت یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کا لہجہ اور تلفظ ہو بہو سیکھ لیں۔

جہاں تک ان کی ان پڑھ اقلیت کا سوال ہے وہ اپنی حد تک عربی الفاظ سیکھ سکتے ہیں اور جو کچھ وہ سیکھ چکے ہوں یا سیکھ سکتے ہوں خدائے تعالیٰ ان سے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا۔ لہٰذا اگرچہ یہ ضروری ہے کہ تمام مسلمان نماز اور

قرآن مجید صحیح عربی زبان میں پڑھیں اور ہر شخص مکلف ہے کہ اپنی قابلیت اور ہمت کے مطابق اسے سیکھے، تاہم اسلام نے سخت اور ناقابلِ برداشت حکم کسی کو نہیں دیا اور اس کی ہمت سے بڑھ کر اس سے کچھ نہیں چاہتا۔

امام کی قبر کو سجدہ

سوال: کیا ائمہ علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ کرنا جائز ہے؟

جواب: جیسا کہ ایک سوال کے جواب میں بتایا جا چکا ہے کہ سجدہ خدائے تعالےٰ کی ذات کے لیے مخصوص ہے اور اس کے علاوہ خواہ کوئی بھی ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے اور اگر کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں تو یہ ان کی مذہب کے بنیادی اصولوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے اور انہیں سمجھانا چاہیے کہ امامؑ یا قبرِ امام کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

تاہم یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان مہروں (سجدہ گاہوں) پر پیشانی رکھنا جو مقاماتِ مقدسہ کی مٹی سے تیار کی جاتی ہیں۔ یہ سجدہ ان مقامات پر مدفون ہستیوں کو نہیں کیا جاتا بلکہ ان احادیث کے مطابق جو پیشوایانِ اسلام سے ہم تک پہنچی ہیں اللہ کو سجدہ کرتے وقت اس مقصد سے کہ زیادہ خضوع عمل میں آئے پیشانی کو سجدہ کی حالت میں زمین پر یا اس چیز پر جو زمین سے اگتی ہو (اور کھانے پینے کی یا معدنی نہ ہو) رکھنا چاہیے اور تربتِ حسینی (خاکِ شفا) بھی وہ پاک مٹی ہے کہ جس پر دین اسلام کے احیاء

کی خاطر امام حسینؑ نے قیام فرمایا۔ اس بنا پر اسے بے حد شرف حاصل ہو گیا ہے۔
خصوصاً "یاد اور یادگار" کے اثرات کی رو سے کربلائے معلی کی مٹی پر سجدہ کرنا نماز پڑھنے والے کے دل میں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ ابن علیؑ کی فداکاری کی یاد کو زندہ کر دیتا ہے اور پاک روحوں اور بیدار دلوں کو اس بلند تر نمونہ کی پیروی کی دعوت دے کر ان کے جذبۂ ایثار و قربانی کو تقویت پہنچاتا ہے۔

ان ورزشوں کے بارے میں کیا حکم ہے

سوال : کیا باکسنگ جیسی ورزشیں اسلام میں حرام ہیں یا نہیں ؟ اور ضمناً جو لوگ اس ورزش کو اپنا پیشہ قرار دیں اور اس کام کے لیے ملازم ہو جائیں ان کے اس فعل کی کیا حیثیت ہے ؟ کیا یہ جائز ہے ؟

جواب : اصولاً ہر وہ کھیل اور جسمانی ورزش جائز ہے جو صحت کے لیے مفید ہو اور کسی خطرے کا موجب نہ ہو بشرطیکہ وہ ناجائز افعال سے تعلق نہ رکھتی ہو چونکہ ہر وہ خطرناک عمل جس سے خود اس شخص کو یا کسی دوسرے کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہو وہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے ممنوع ہے اور باکسنگ کی ورزش خطرے سے خالی نہیں ہے اس لیے ایسی ورزشوں سے اجتناب برتنا چاہیے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اب تک کئی نوجوان اس ورزش کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور اس خطرناک کھیل میں بہت سی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔

اس بنا پر جسم انسانی کے لیے مفید ورزشیں کہ جن سے معاشرے کو حقیقی فائدہ پہنچتا ہو ان میں شریک ہونے یا ملازمت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہر صورت میں ناجائز ہے۔

ایک امریکی مسلمان کے سوالات

کچھ عرصہ گزرا ہے کہ ایک امریکی مسلمان نے ہمیں بہت سے سوالات ارسال کیے جن میں سے اکثر پراز معلومات تھے۔ لہٰذا ہم انہیں ۱۵ نمبروں کے تحت ان کے جوابات کے ساتھ یہاں درج کرتے ہیں۔

سوال: امریکہ کی مختلف ریاستوں میں شادی بیاہ اور طلاق کے متعلق مختلف قواعد وضوابط نافذ ہیں لیکن ان کے اصول تقریباً یکساں ہیں۔ چونکہ امریکہ میں کوئی ایسا اسلامی مذہبی نمائندہ[^1] موجود نہیں جو مسلمانوں کی شادیوں کو رجسٹر کر سکے لہٰذا اس بارے میں وہاں کے مسلمانوں کا فریضہ کیا ہے؟

جواب: امریکہ کے مسلمان مرد اور عورت کسی ایسے شخص کو اپنا وکیل مقرر کر سکتے ہیں جو نکاح کا صیغہ جاری کر سکتا ہو اور جب وکیل صیغۂ نکاح پڑھ دے تو ان کی شادی اسلامی نقطۂ نگاہ سے قانونی شکل اختیار کرے گی اور اگر کوئی ایسا شخص نہ

---

[^1]: الحمد للہ اب امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں کئی اسلامی سنٹر منجملہ اسلامک سیمنری نیویارک کام کر رہے ہیں۔

مل سکے تو وہ خود نکاح کا صیغہ پڑھ سکتے ہیں اور اگر یہ کام عربی زبان میں انجام نہ دے سکیں تو انگریزی زبان استعمال کر سکتے ہیں۔

اسلامی احکام کی رو سے یہ ضروری نہیں کہ عقد کے موقع پر ہی عورت کا مہر معین کر دیا جائے۔ تاہم اگر مہر معین نہ ہو تو عورت شادی کے بعد مرد سے اپنے مناسبِ حال مہر کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اس بنا پر عورت کو مہر دینا ضروری ہے لیکن عورت اگر چاہے تو اپنے مہر سے کلی یا جزوی طور پر دستبردار ہو سکتی ہے۔

سوال ۲: مغربی ممالک کے اوقاتِ کار کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کیا "نماز جمعہ" شب جمعہ میں یا اتوار کے دن کسی وقت ادا کی جا سکتی ہے جب کہ لوگ چھٹی پر ہوتے ہیں؟ اور کیا مسجد میں موسیقی کے ساز استعمال کیے جا سکتے ہیں؟

جواب: دیگر اسلامی عبادات کی طرح کہ جن کا وقت معین ہے نماز جمعہ بھی ــــ اس کے مقررہ وقت میں یعنی فقط جمعہ کے دن ــــ ظہر شرعی کے بعد ادا کرنی چاہیے اور شب جمعہ میں یا اتوار کے دن یا کسی بھی دوسرے وقت میں نہیں پڑھی جا سکتی۔

اسلام کے نقطۂ نگاہ سے موسیقی کے آلات کا استعمال جائز نہیں۔ لہذا مسجد میں یا کسی اور مقام پر آلاتِ موسیقی کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

سوال ۳: کیا امریکہ کی مسلمان عورت کو مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے کوئی مخصوص لباس پہننا چاہیے یا وہی لباس کافی ہے جو وہ عموماً پہنتی ہو؟ اور اگر مخصوص لباس پہننا ضروری ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: مسلمان عورت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کوئی مخصوص لباس پہنے۔ جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ نماز کی حالت میں اپنے چہرے اور ہاتھوں کے کلائی سے نچلے حصے کے علاوہ سارا بدن ڈھانپ لے۔

سوال ۴: کہا جاتا ہے کہ جو شخص "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" "وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" یعنی کلمہ شہادت پڑھ لے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ اگر مسلمان ہونے کی یہی ایک شرط ہے تو کیا یہ کسی شخص کے مسلمان ہونے کا معیار بن سکتی

ہے؟ مثلاً ایک ایسے شخص کو حقیقی مسلمان کیسے سمجھا جا سکتا ہے جو نہ نماز پڑھتا ہو، نہ زکات دیتا ہو، نہ روزے رکھتا ہو اور نہ ہی خدائے تعالےٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرتا ہو، کیا ایسے لوگ فقط دکھاوے کے مسلمان نہیں ہیں؟

جواب: مسلمان ہونے کے کئی مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ تو خدائے تعالےٰ کی توحید اور پیغمبرِ اسلام کی نبوت پر ایمان ہی ہے جس کا تعارف "شہادتین" کے دو جملے کراتے ہیں۔ بعد کے مراحل اسلامی احکام اور قوانین پر عمل سے متعلق ہیں اور جو چیز جاودانی خوش بختی کا موجب ہے وہ عقیدے اور ایمان سے مربوط اعمالِ صالح ہیں۔

لہٰذا جو شخص مندرجہ بالا دو بنیادی چیزوں یعنی توحید اور آنحضرتؐ کی نبوت کا اقرار تو کرے لیکن اس کے اعمال و کردار اسلامی احکام و فرامین سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اسے جماعتِ مسلمین میں وہ حقوق حاصل ہوں گے جو ایک مسلمان کے لیے مقرر ہیں لیکن وہ ایک سچا مسلمان، سعادتمند اور نجاتِ اخروی کا حقدار نہ ہوگا۔

سوال ۔۵: اگر ایک امریکی بالغ مرد مسلمان ہو جائے تو کیا (اگر وہ ختنہ شدہ نہ ہو تو) اس کا ختنہ کرانا ضروری ہے؟

جواب: مسلمان کے لیے ختنہ کرانا واجب ہے اور اگر کوئی شخص بالغ ہونے کے بعد مسلمان ہو تو اس پر بھی ختنہ کرانا واجب ہے۔

سوال ۔۶: ایک امریکی مسلمان کتنی زکات دے اور کس کو دے؟ اور اس زکات کی اس مقدار کا حساب اپنی ماہانہ تنخواہ میں سے کس طرح کرے؟

جواب: ماہانہ تنخواہ پر زکات نہیں ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام میں ٹیکس کا ایک اور قانون "خمس" کے نام سے بھی موجود ہے اور چونکہ امریکہ کے شہروں کا ماحول صنعتی اور تجارتی ہے لہٰذا ایک امریکی مسلمان کی آمدنی میں اضافے پر عموماً زکات نہیں بلکہ خمس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جو شخص ماہانہ تنخواہ پاتا ہو اور اس کی آمدنی پر خمس واجب ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تمام سالانہ آمدنی کا حساب کرے اور اپنے سال بھر کے تمام اخراجات منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی

بچے اس کا پانچواں حصہ اسلامی بیت المال میں جمع کرا دے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ضروری ہے کہ اس پانچویں حصے کا نصف غریب سیدوں کو دیا جائے جو کہ زکاتِ اسلامی سے محروم ہیں اور بقایا نصف حصہ مجتہدِ عادل کی اجازت سے مفادِ اسلامی کے لیے خرچ کیا جائے۔

جو شخص ماہانہ تنخواہ پاتا ہو وہ ایسے بھی کر سکتا ہے کہ اس تمام رقم کو جو اسے سالانہ بطور خمس ادا کرنی چاہیے سال کے بارہ مہینوں پر تقسیم کر دے اور پھر ہر مہینے جو رقم فی ماہ بنتی ہو وہ ادا کرتا رہے۔

سوال ۷: مغربی ممالک اور بالخصوص امریکہ میں لوگوں کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی تنظیم کچھ اس طرز پر ہو گئی ہے کہ لوگ مجبور ہیں کہ اپنی ضرورت کی چیزیں مثلاً رہائشی مکان، موٹر کار اور ریفریجریٹر وغیرہ قسطوں پر اور معینہ مدت کے لیے خریدیں جب کہ ہم جانتے ہیں کہ اس کام کی بنیاد سود پر ہے جو اسلام میں جائز نہیں۔ اس صورت میں امریکی مسلمانوں کے لیے عمل کی صورت کیا ہے؟

جواب: جو چیز اسلام میں حرام ہے وہ سود پر قرض لینا یا دینا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص کچھ رقم اس شرط پر دوسرے سے بطور قرض لے کہ ادائیگی کے وقت کچھ زیادہ دے گا تو وہ ربا (سود) اور حرام ہے لیکن کوئی چیز ادھار خریدنے اور اس کی قیمت قسطوں میں ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اس کا شمار "سود" میں نہیں ہوتا اگرچہ ادھار کی صورت میں اس چیز کی قیمت نقد کے مقابلے میں زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

سوال ۸: کیا ایک امریکی مسلمان امریکی عدالتوں سے رجوع کر سکتا ہے؟

کیا ایک امریکی مسلمان کسی منصب کے لیے ایک غیر مسلم کا انتخاب کر سکتا ہے اگرچہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اسلام کے موافق نہیں ہے؟

کیا ایک امریکی مسلمان اسلامی قانون کے مطابق اس قسم کا پابند ہوتا ہے جو انجیل پر ہاتھ رکھ کر اٹھاتا ہے یا اس صورت میں اسے تقاضا کرنا چاہیے کہ

قرآن مجید لایا جائے تاکہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھائے؟

جواب: جب اپنا حق حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو اور اس کا حصول وہاں کی عدالتوں سے رجوع کرنے پر منحصر ہو تو ایک امریکی مسلمان ان عدالتوں سے رجوع کرسکتا ہے۔

ایک امریکی مسلمان کسی قومی منصب کے لیے ایک غیر مسلم کا انتخاب کرسکتا ہے بشرطیکہ اس شخص کو انتخاب کے ذریعے جو مقام حاصل ہو وہ اسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اقدام کرنے کے لیے استعمال نہ کرے اور اس انتخاب سے کسی دوسرے کا حق بھی پامال نہ ہو لیکن اگر صورت اس کے برعکس ہو تو پھر جائز نہیں ہے۔

چونکہ یہودیوں اور عیسائیوں کی آسمانی کتابوں کا کچھ حصہ مقدسات پر مشتمل ہے (اگرچہ ان کا بہت بڑا حصہ تحریف شدہ ہے) تاہم جو شخص ان کتابوں پر قسم کھائے اس کے لیے یہ بات اخلاقی طور پر مناسب ہے کہ اپنی قسم پر قائم رہے اور اس کی خلاف ورزی نہ کرے لیکن اسلام کی رو سے اس قسم کی پابندی لازم نہیں اور اسے توڑنے کا کوئی کفارہ بھی نہیں۔

سوال ۹: کہا جاتا ہے کہ مسلمان مرد اہل کتاب عورتوں سے شادی کرسکتا ہے لیکن مسلمان عورت اہل کتاب مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اگر اسلام نے مشرکین سے شادی بیاہ حرام قرار دیا ہے تو کیا ان عیسائیوں سے شادی ممنوع نہیں جو تثلیث اور الوہیت مسیح یا کلیسا کے پوپوں کی شفاعت کے معتقد ہیں؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملحدوں کے ساتھ شادی بیاہ مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس صورت میں کیا ایک مسلمان کمیونسٹ پارٹی کی ایک ممبر سے شادی کرسکتا ہے جو ملحد ہیں اور خدائے تعالٰے کی ہستی سے منکر ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

کیا ایک مسلمان کا ان جدید انسان دوستوں سے شادی بیاہ کرنا جائز ہے جو خدائے تعالیٰ کو انسان کے دماغ میں محض ایک تصور گردانتے ہیں۔

کیا ایک امریکی مسلمان ایک کیتھولک عیسائی عورت سے شادی کر سکتا ہے جو اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کی شادی کی رسوم ایک کیتھولک پادری کے ذریعے گرجا میں انجام پائیں اور جسے ایک مخصوص سرٹیفکیٹ پر دستخط کرنا ہوتے ہیں کہ اس کے بچوں کی تربیت کیتھولک تعلیمات کے مطابق ہوگی؟

جواب: ایک مسلمان مرد اہلِ کتاب عورتوں سے فقط متعہ (ازدواجِ موقت) کر سکتا ہے۔ مسلمان عورت کی اہلِ کتاب مرد سے شادی ناجائز ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی اور گھریلو معاملات میں عورتیں ذہنی طور پر عموماً مردوں کے زیرِ اثر ہوتی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں کے عقائد اور طور طریقے اختیار کریں۔ اس لحاظ سے اگر مسلمان عورت اہلِ کتاب مرد کے نکاح میں آئیگی تو ممکن ہے کہ ذہنی طور پر اس سے متاثر ہو جائے اور اس کے اسلامی عقائد متزلزل ہو جائیں۔ لہٰذا ایک مسلمان عورت کو ایک غیر مسلم مرد سے ازدواجی رشتہ ہرگز قائم نہیں کرنا چاہیے تاہم مردوں کے معاملہ میں ایسا نہیں ہے۔

اسلام کے نقطۂ نگاہ سے ایک عیسائی اور بت پرست مشرک میں فرق ہے اور اسلام نے بت پرستی کو کسی طور بھی تسلیم نہیں کیا۔ اس فرق کی دو وجوہ ہیں:

۱۔ مشرک اور بت پرست خدائے تعالےٰ کے وجود پر عقیدے کے بعد نبوت کو، جو تمام آسمانی مذاہب کی دوسری بنیاد ہے، قبول نہیں کرتا اور چونکہ وہ اس اہم اور بنیادی چیز کو قبول نہیں کرتا اس لیے مشرکوں کے لیے آسمانی احکام کو تسلیم کرنے اور سعادتِ اخروی کی راہ پر گامزن ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ کیونکہ بالآخر وہی لوگ اسلام کی جانب مائل ہوتے ہیں جو نبوت اور پیغمبری کے اصولوں کے معتقد ہوں اور اس اعتقاد کی بدولت بتدریج اس مذہب کے آسمانی احکام اور قوانین قبول کرتے ہیں۔

۲ - بت پرستوں کا شرک مکمل طور پر واضح اور کھلا ہوا ہے۔ اس کے برعکس عیسائیت میں ایک کمتر درجے کا شرک ہے کیونکہ وہ "تثلیث" کے ساتھ ساتھ "وحدت" کا دم بھی بھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "تین عدد ہونے" سے "ایک ہونے" پر کوئی زد نہیں پڑتی (اگرچہ یہ ایک ناقابلِ قبول تناقض ہے)۔

ایک ملحد سے یعنی ایسے شخص سے جو خدائے تعالیٰ پر عقیدہ نہ رکھتا ہو شادی بیاہ کرنا جائز نہیں لہٰذا ایک مسلمان مرد ایک ملحد عورت سے شادی نہیں کرسکتا اور ایک مسلمان عورت کی ایک ملحد مرد سے شادی بھی ممنوع ہے۔

اسی اصول کی رُو سے وہ لوگ جو خدا کو محض مذہبی لوگوں کا ایک "تصور" سمجھتے ہیں اور اس کے وجودِ حقیقی پر عقیدہ نہیں رکھتے ملحد ہیں اور ان سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا جائز نہیں۔

کوئی مسلمان یہ وعدہ نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے بچوں کو عیسائی مذہب کے پیروکار بننے دے گا۔

سوال - ۱۰ : کیا ایک امریکی مسلمان اسلامی عیدوں کے علاوہ دوسرے مذہب کی عیدوں اور بالخصوص سالِ نو NEW YEAR'S DAY اور EASTER کے تہواروں اور کاج کے درخت PINETREE کی تیاری کی رسموں میں شرکت کرسکتا ہے اور غیر مسلموں کو مبارکباد کے پیغام اور تحفے تحائف وغیرہ ارسال کرسکتا ہے؟

جواب : غیر اسلامی رسوم اور آداب کا رائج کرنا اور ان مراسم میں شرکت کرنا مسلمان کے لیے صحیح نہیں۔ ان میں سے کچھ تہوار ایسے ہوتے ہیں جو صحیح بنیاد نہ رکھنے کے علاوہ عموماً ممنوع مراسم کے حامل ہوتے ہیں۔ مسلمان کو چاہیے کہ اسلامی تعلیمات کو رواج دے۔

سوال - ۱۱ : کیا تدفین کے وہ مراسم جو ان دنوں امریکہ میں مروج ہیں (مثلاً مردے کے بدن کے بگاڑ اور بدبو کی روک تھام کے لیے کیمیائی مواد کا استعمال یا مردے کو تابوت میں رکھنا) اسلامی قوانین کی رو سے جائز ہیں؟

کیا کفن کے لیے سفید کپڑے کا استعمال ضروری ہے یا کوئی عام کپڑا استعمال کیا جا سکتا ہے ؟
کیا مردے کے بدن کو نذرِ آتش کر دینا جائز ہے اور ایک مسلمان کی تدفین اور اس کے لیے قرآن خوانی کی رسوم گرجے میں ادا کی جا سکتی ہیں یا ان کا مسجد میں ادا کرنا لازمی ہے ؟ جو مسلمان مسجدوں اور اسلامی معاشروں سے دور زندگی بسر کر رہے ہیں ان معاملات میں ان کا فریضہ کیا ہے ؟

جواب : ایک مسلمان میت کے لیے کفن کا استعمال (اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اسلام نے بتائی ہے) واجب ہے لہٰذا میت کو عام کپڑوں کے ساتھ دفن کرنا جائز نہیں۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ کفن سفید ہی ہو۔ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق مردے کے جسم کو جلا دینا حرام ہے اور یہ ضروری ہے کہ اسے زمین میں دفن کیا جائے اور دفن واجب یہ ہے کہ میت کا بدن اس طرح زمین میں چھپا دیا جائے کہ اس کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو اور اس کی بو نتھنوں تک نہ پہنچے اور وہ حیوانات کے گزند سے بھی محفوظ رہے۔

بدبو کی روک تھام کے لیے کیمیائی مواد کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ اس میں مسلمان میت کی توہین کا کوئی پہلو نہ ہو۔ اسی طرح اگر دفن واجب عمل میں آ جائے اور دوسرے مذاہب کی تقلید کرنے کی نیت بھی نہ ہو تو میت کا جسم تابوت میں رکھنے کی کوئی ممانعت نہیں۔

مناسب یہ ہے کہ مسلمان کے "ختم" اور تدفین کی رسوم گرجا میں ادا نہ کی جائیں لہٰذا جو مسلمان مساجد سے دور رہتے ہوں وہ یہ رسوم کسی دوسرے مرکز یا ذاتی مکانوں میں ادا کر سکتے ہیں یا ان کی ادائیگی سے ہی اجتناب برت سکتے ہیں۔

سوال ۱۲: اگر یہ اطمینان نہ ہو کہ آیا ہوٹل کے کھانے میں سور کا گوشت یا چربی استعمال کی گئی ہے تو کیا وہ کھانا کھایا جا سکتا ہے ؟

عموماً یہ اطمینان نہیں کیا جا سکتا کہ آیا گوشت ایسے جانور کا ہے جسے اسلامی احکام

کے مطابق ذبح کیا گیا ہو۔ اس صورت میں ایک امریکی مسلمان کا طریقۂ عمل کیا ہے؟ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے کہ دیگر اقسام کو چھوڑے اور یہودیوں کے ذبیحے سے استفادہ کرے؟

جواب: غیر اسلامی علاقوں میں بازار یا ہوٹل کا گوشت فقط اس صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے جب کہ گوشت بیچنے والا یا ہوٹل کا مالک مسلمان ہو اور احتمال اس بات کا ہو کہ یہ گوشت ذبیحے کے متعلق اسلامی احکام کی پابندی کرتے ہوئے تیار کیا گیا ہے اور مسلمان دکاندار نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔

اور اگر انسان ایک غیر مسلم سے گوشت خریدے لیکن اسے یقین ہو کہ جانور کو اسلامی احکام کے مطابق ذبح کیا گیا ہے تو اس گوشت کے استعمال کی کوئی ممانعت نہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے ممنوع ہے۔

سوال ۱۳: ایک امریکی مسلمان فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے اپنا مکہ کا سفر کس طرح ترتیب دے؟ اس سفر کے کل اخراجات کا تخمینہ کیا ہے؟

جواب: کوئی مسلمان، خواہ وہ دنیا کے کسی خطے میں بھی رہتا ہو، جب اس کے سال بھر کے اخراجات سے اتنی رقم بچ جائے کہ وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے قابل ہو تو اسے چاہیے کہ مقررہ ایام میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ معظمہ کا سفر اختیار کرے۔ سفر کے اخراجات مثلاً ہوائی جہاز کے (آنے جانے کے) کرائے اور پاسپورٹ کی تیاری اور اسی قبیل کے دوسرے اخراجات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے امریکی ہوائی کمپنیوں اور امریکی حکومت کے متعلقہ محکموں سے رجوع کرنا چاہیے۔ "مقاماتِ حج" میں چند روزہ قیام کے اخراجات بطورِ متوسط چار سو ڈالر سے تجاوز نہیں کرتے۔

سوال ۱۴: امریکہ کی مختلف ریاستوں میں وصیت اور وراثت سے متعلق قوانین میں باہم فرق ہے لیکن بہرحال زیادہ تر صورتوں میں وہ اسلامی قوانین کے خلاف ہیں۔ اس بارے میں امریکی مسلمانوں کا فریضہ کیا ہے؟

جواب: امریکہ کے ملکی قوانین اور اسلامی قوانین کے مابین اختلاف کی صورت میں اگر

ایک امریکی مسلمان اسلامی قوانین پرعمل نہ کرسکے اور امریکہ کے ملکی قوانین پر عمل کرنے پر مجبور ہو تو ایسے حالات میں اس پر گناہ کا بار نہیں ہوگا۔

سوال۔۱۵: کیا اسلامی قوانین عمومی بیمے کو تجارتی بیمے پر ترجیح دیتے ہیں؟ جب ایک مسلمان کم رقم کے ساتھ اپنا تجارتی بیمہ کرسکتا ہو تو اس کا فریضہ کیا ہے اور کیا ایک امریکی مسلمان اس بیمے کے حصص فروخت کرسکتا ہے؟

جواب: اسلامی قواعد وضوابط کے مطابق تجارتی بیمہ (چونکہ یہ معاہدہ ہے اور اس پر عام احکام کا اطلاق ہوتا ہے) صحیح اور قانونی ہے اور اس لحاظ سے اس قسم کے بیمے اور عمومی بیمے میں کوئی فرق نہیں۔ لہذا ایک مسلمان اپنا تجارتی بیمہ کراسکتا ہے اور اس کے حصص بھی فروخت کرسکتا ہے۔

عہدِ رفتہ میں مسلمانوں کی ترقی اور عصرِ حاضر میں ان کی پسماندگی کی وجوہات کیا ہیں؟

سوال: گزشتہ زمانے میں مسلمانوں کی ترقی اور پیشرفت کے اسباب کیا تھے اور اب ان کے انحطاط اور پسماندگی کی کیا وجوہات ہیں؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ کسی زمانے میں مسلمان روئے زمین کی کئی ایک متمدن قوموں پر حکومت کرتے تھے اور کاروانِ تمدّن کے قافلہ سالار تھے لیکن اب وہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے کاسہ لیس بن گئے ہیں؟

جواب: بلاشبہ یہ سوال قابلِ توجہ اور نازک سوالات میں سے ہے اور عین مناسب ہے کہ اس کے متعلق ایک کتاب لکھی جائے۔ معروف مصری دانشور فرید وجدی نے اپنے دائرۃ المعارف میں مادۂ "علم" میں مسلمانوں کی ترقی کی دس وجوہ گنوائی ہیں اور بعض دوسرے دانشوروں نے بھی اس بارے میں بحث اور گفتگو کی ہے لیکن درحقیقت اس ترقی اور اس پسماندگی کی بنیادی وجہ اسلامی تعلیمات کی پیروی اور آجکل ان سے انحراف کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ صدرِ اسلام میں

مسلمان زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کی تعلیمات سے فیضان حاصل کرتے تھے لیکن آج زیادہ تر مقامات کے مسلمان اسلام کی صحیح راہ سے منحرف ہو گئے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حقیقی مسلمان نہیں بلکہ جغرافیائی مسلمان ہیں۔ ان کے انحطاط کی بنیادی وجہ تو بس یہی ہے۔ علاوہ ازیں ہم ذیل میں ان کی ترقی و سربلندی اور تنزل و انحطاط کے کچھ اسباب کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

ہمہ پہلو فداکاری

۱۔ صدرِ اسلام کے مسلمان ہر لحاظ سے فداکار تھے۔ ان کی نظروں میں دین اسلام اور اس کے احکام بھائی، بیوی، فرزند، گھر بار، منصب اور دولت سے زیادہ گراں قدر تھے۔ وہ اپنے تمام مادی مفادات کو اسلام پر فدا کر دیتے تھے اور تاریخ اسلام بالخصوص رسولِ اکرمؐ نے جو جنگیں لڑیں وہ اس حقیقت کی زندہ گواہ ہیں لیکن اب بہت سے لوگوں نے دین کو ایک طرف ڈال دیا ہے اور اس فداکاری کا رتی بھر وجود باقی نہیں رہا۔ بعض لوگوں کے لیے اسلام صرف اسی حد تک محترم ہے کہ ان کے مال اور حیثیت میں رکاوٹ نہ ڈالے بصورت دیگر بہت کم لوگ ہوں گے جو اسلام کی خاطر کسی بڑے فائدے سے ہاتھ کھینچ لیں چونکہ صدر اسلام کے مسلمانوں کو نظریۂ اسلام کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی اور انہوں نے اسے اپنے عزیزوں کی جانیں دے کر خریدا تھا اس لیے وہ اس کی قدر و منزلت کو جانتے تھے لیکن ہم نے اسلام کو اپنے ماں باپ سے ورثے کے طور پر حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عملاً ہماری نظروں میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

۲۔ ایک طرف اتحاد اور اتفاق اور دوسری طرف اختلاف اور نفاق ترقی اور انحطاط کے دو عامل ہیں۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان آپس میں متحد اور متفق تھے اور قرآن کے حکم کے مطابق باہم بھائی تھے لیکن رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد جو اختلافات پیدا ہوئے ان کے باوجود امیرالمومنین علیہ السلام اور ان کے گرامی قدر فرزندوں نے

حسن سیاست کے نتیجے میں اسلام کی پیشرفت اور مسلمانوں کی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی۔ وہ اپنے مسلمہ حقوق سے اس لیے دستبردار ہو گئے کہ کم از کم اسلام کے اصول تو محفوظ رہیں لیکن اب مسلمانوں اور ان کے لیڈروں کے درمیان نفاق اور اختلاف کمال کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے فرقہ بندی میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور ہر فرقہ دوسرے کو فاسق اور دین سے خارج قرار دیتا ہے اور اسے نیچا دکھانے اور ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آجکل مسلمانوں کے مابین اختلافات بہت بڑھ گئے ہیں اور اسلام کا حقیقی چہرہ غلط فہمیوں اور کوتاہ اندیشیوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ مسلمان اپنی گزشتہ عظمت حاصل کریں گے۔

حالاتِ زمانہ سے واقفیت

۳۔ یہ چیز خود ان قدیم مسلمانوں کی ترقی کا ایک اہم سبب تھی۔ مسلمان ہمیشہ اپنے آپ کو جدید ہتھیاروں اور تازہ ترین علوم سے آراستہ رکھتے تھے۔ غزوۂ حنین کے وقت رسولِ اکرمؐ کو اطلاع ملی کہ یمن میں قلعوں کو توڑنے اور مضبوط گڑھوں کو زمین بوس کرنے کے لیے ایک نیا آلہ ایجاد ہوا ہے۔ آپ نے فوراً کچھ لوگوں کو تیار کیا تاکہ وہ یمن جائیں اور اس کی ساخت اور طریقۂ استعمال سے واقفیت حاصل کر لیں[1]

صدرِ اسلام کے مسلمانوں نے کئی صدیوں تک دوسروں کے علوم مثلاً فلسفہ، طبیعیات، کیمیا، حساب، ہندسہ، ہیئت اور نجوم وغیرہ کے ترجمے عربی زبان میں کیے اور انہیں اپنی فکر و نظر سے مزید ترقی دی۔ نیز بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں قائم کیں۔ چنانچہ وہ دوسروں کی علمی بالادستی سے بے نیاز ہو کر بذاتِ خود مختلف علوم

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ جلد ۲

کے مشعل بردار بن گئے۔ بڑی مدت تک بغداد، شام، مصر، اندلس اور ایران کے تعلیمی مراکز سے دنیا بھر کے شائقین اپنی علم کی پیاس بجھاتے رہے لیکن آج بیشتر مسلمانوں نے زمانے کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پرانے طور طریقوں سے ہی کام چلاتے رہیں اور تمام دنیا پہ اپنی سیادت کا سکہ بھی جمائیں۔ اب جب کہ دنیا میں نت نئی تبدیلیاں آرہی ہیں اور علوم و فنون اور تہذیب و تمدن ہر لحظہ ترقی و کمال کی طرف رواں ہیں لیکن اسلام کی تبلیغ کے ذرائع اور اس کے معارف کی نشر و اشاعت کے وسائل ہنوز اپنی پہلی حالت پر باقی ہیں۔

یہ تین امور ان عوامل کا ایک حصہ تھے جن کی بدولت صدرِ اسلام کے مسلمان شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوئے۔ ان کے علاوہ کئی اور عوامل کا بھی ان کی پیشرفت میں کافی حصہ تھا جن کی تشریح سے ہم بخوف طوالت پرہیز کرتے ہیں اور اس بحث کو مندرجہ ذیل آیت کے ساتھ ختم کرتے ہیں جس میں مسلمانوں کو برتری کے اسباب بتائے گئے ہیں۔

خدائے تعالیٰ ملتِ اسلامیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اگر تم واقعی مومن بن جاؤ تو تم دنیا کی تمام اقوام سے برتر اور بالاتر ہو۔"[1]

اس بیان کی رو سے اور مذکورہ بالا آیت شریفہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ آیا اس بات کی کوئی امید ہے کہ مسلمان اپنی عظمتِ پارینہ دوبارہ حاصل کرلیں؟

اس سوال کا جواب اثبات میں ہے اور جو مطالب پہلے سوال کے سلسلے میں بیان کیے گئے ہیں انہیں ملاحظہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جو اسباب آغازِ اسلام میں مسلمانوں کی ترقی اور پیشرفت کا باعث بنے تھے اگر وہ نئے سرے سے پیدا ہو جائیں اور ان سے استفادہ کیا جائے تو مسلمانوں کو دوبارہ وہی شان و شوکت

---

[1] سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۱۳۹

نصیب ہو سکتی ہے۔

اگر موجودہ دور کے مسلمان ابتدائے اسلام کے مسلمانوں کی طرح فداکار ہوں اور آپس میں اتحاد و اتفاق کو قائم رکھیں اور مسلمان قائدین موجودہ دور کے فکری رجحانات کو اچھی طرح سمجھ لیں تو انہیں بار دیگر سربلندی اور عظمت حاصل ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ہر قسم کی تبدیلی اور ارتقا قوانینِ اسلام کی حدود کے اندر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ "وقت کی روح" کو سمجھنے کے تصور کو تحریف یا قوانینِ اسلام کو میدانِ زندگی سے باہر نکال پھینکنے کا بہانہ بنا لیا جائے۔

نوجوان دینی اجتماعات سے کیوں دُور بھاگتے ہیں؟

سوال: وہ کون سے عوامل ہیں جو اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ نوجوانوں کا ایک طبقہ دینی مجالس میں شرکت کرنے سے اجتناب کرتا ہے؟ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اس عظیم مشکل کو رفع کرنے کے لیے اقدام کیا جائے؟ اس مشکل کو حل کرنے کا کیا طریقہ ہے اور نوجوانوں کو دینی مجالس کی جانب متوجہ کرنے کے لیے ہمیں کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟

جواب: ہمارا خیال ہے کہ بہت سے نوجوانوں کے دینی مجالس سے دوری اختیار کرنے کے بہت سے عوامل ہیں جن میں سے دو سب سے زیادہ اہم ہیں:

اوّل تو وہ زہریلا پراپیگنڈا جو بیرونی ایجنٹ ایک مدت سے ہمارے نوجوانوں کے درمیان کرتے رہے ہیں جس نے انہیں دینی مجالس اور روحانیت سے بدظن کر دیا ہے کیونکہ ان کے سامنے حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

دوسری چیز بعض دینی مجالس میں نظم وضبط کا فقدان اور کسی ایک مجالس میں تقریر اور دینی تبلیغ کے ان صحیح اصولوں کی طرف سے عدم توجہی ہے کہ جن کے ذریعے سے تعلیم یافتہ

نوجوانوں کے تشنہ افکار کو اسلام کی عالی قدر تعلیمات سے سیراب کیا جا سکتا ہے۔

یہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کے اثر سے ہمارے بہت سے نوجوان ان مجالس سے دور ہو گئے ہیں لیکن خوش قسمتی سے پچھلے چند سالوں میں ہمارے نوجوان بیدار ہو گئے ہیں اور ان بیرونی عناصر کی بدنیتی کو بھانپ گئے ہیں جو ان کے ذہنوں پر زہر چھڑکا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اب دینی جلسوں میں اکثریت یا ایک کثیر تعداد نوجوانوں کی ہوتی ہے اور ہم خود اس قسم کے جلسوں کے عینی شاہد ہیں۔

نوجوانوں کے اس فرار کے دوسرے عامل کے سلسلے میں بھی تدابیر اختیار کی گئی ہیں اور اب ایسے افراد کی کمی نہیں جو وقت کی پکار سے اور صحیح اسلامی منطق کے ذریعے سے نوجوانوں کے ذہنی الجھاوؤں کو سلجھا سکتے ہیں۔ گو ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تعداد موجودہ ضرورت کے مطابق نہیں ہے۔

تعددِ ازواج سے غلط استفادہ کرنے پر کیسے قابو پایا جائے؟

سوال: یہ درست ہے کہ جب مرد تعدد ازواج اور طلاق کے بارے میں عدل و انصاف کے اصول کی رعایت کریں، یعنی اپنی عورتوں کو بلاوجہ طلاق نہ دیں اور متعدد عورتوں کو پریشانی میں مبتلا نہ کریں تو عورت کی شخصیت، مقام اور حقوق محفوظ رہتے ہیں اور وہ توہین اور ظلم سے بچ جاتی ہے اور بہت سے مواقع پر عورتوں اور مردوں کے مابین توازن درہم برہم ہونے سے پیدا ہونے والی مشکلات انصاف کی رعایت کرنے سے حل ہو جاتی ہیں۔

لیکن ہمارے زمانے میں جب کہ بدقسمتی سے بہت سے مسلمان صرف نام کے مسلمان ہیں اور مذہبی قواعد و ضوابط کی پابندی بہت کم کرتے ہیں تعدد ازواج کے قانون سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں ایسے ہوس باز مردوں کے بارے میں کیا پیش بینی کی گئی ہے اور ان کے اس ناجائز استفادہ کو کس طرح محدود کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اصولاً قوانین خواہ کتنے ہی اچھے اور معقول ہوں جب تک ان کے اجراء کی ضمانت موجود نہ ہو وہ معاشرے کی خوش بختی اور سعادت کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔

اگرچہ ممکن ہے کہ تعلیم و تربیت اور خدا پر ایمان بہت سے لوگوں کو ناجائز فائدہ اٹھانے اور قانون توڑنے سے باز رکھے' لیکن اس کے باوجود مذکورہ عوامل کبھی بھی تمام لوگوں کو مکمل طور پر فرض شناس اور اسلامی احکام کا پابند نہیں بنا سکتے کسی نہ کسی طرح کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو قانون کے خلاف چلتے ہیں اور اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لہٰذا اجتماعی عدالت کے حصول' قانون کے تحفظ اور مظلوموں کی امداد کے لیے ایک ذمہ دار حاکم کا ہونا ضروری ہے جو لوگوں کے اعمال پر نظر رکھے اور قانون پر عملدرآمد کرانے کے لیے اقدامات کرے اور وہ حکومتِ اسلامی ہی ہو سکتی ہے۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر اسلام نے اسلامی حکومت کو قوانین کے اجراء کے سلسلے میں وسیع اختیارات دیے ہیں تاکہ جب لوگ قوانین کے اجراء اور اپنے فرائض کو پہچاننے کی کافی سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں اور اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا چاہیں اور دینی قوانین کا غلط فائدہ اٹھائیں تو اسلامی حکومت یہ حق رکھتی ہے کہ وہ قانون کی حمایت اور مظلوموں کی طرفداری کی خاطر اقدام کرے اور تجاوز کرنے والے اور غلط فائدہ اٹھانے والے کو اس کے اصلی مقام پر لا بٹھائے۔

اس معاملے میں طلاق اور تعدد ازدواج اور اسلامی فقہ کے دوسرے شعبوں میں کوئی فرق نہیں یعنی جس طرح اسلامی حکومت جرائم اور دراز دستیوں کے بارے میں مظلوموں کی طرفدار اور ظالموں کی دشمن ہوتی ہے اسی طرح اگر طلاق اور تعددِ ازواج عورت پر تعدی اور زیادتی کا باعث ہو اور اس کے ذریعے سے مرد کی طرف سے عورت کی حیثیت اور حقوق میں تجاوز ہوتا ہو تو اسلامی حکومت حق رکھتی ہے کہ اپنے زیر تسلط علاقے میں طلاق اور تعدد ازواج میں مردوں کو غلط استفادہ کرنے سے روکے اور مظلوم عورتوں کی حمایت کرے۔

اس کے علاوہ فقہ اسلامی کے مختلف شعبوں کے سلسلے میں یہ نکتہ لازماً ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کے قوانین ایک زنجیر کی کڑیوں کی مانند متصل اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہ کبھی نہیں کرنا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ کر فقط دوسرے پر نظر ڈالیں اور پھر بحث اور تنقید شروع کر دیں۔ اسلام کے قوانین کو ہر ماحول میں نہیں بلکہ ہمیشہ اس ماحول کو مدنظر رکھ کر جانچنا چاہیے جہاں اسلام حکومت کرتا ہو اور جہاں اس کے احکام جاری ہوں۔ مثلاً حدود و دیات، قضاوت و حکومت اور ازدواج و طلاق کے بارے میں احکام اسلام کا مطالعہ اس ماحول میں کرنا چاہیے جس میں اسلام کے عقائد و واجبات کے تمام اصول و ضوابط مکمل طور پر نافذ العمل ہوں۔

اس لحاظ سے جب اسلام کے تمام احکام حقیقی طور پر جاری کیے جائیں تو قدرتی طور پر کوئی شخص بھی قانون شکنی یا دوسروں کے حقوق میں تجاوز نہیں کرے گا اور مرد تعدد ازدواج کے قانون سے فقط عورت سے شادی کرنا اور طلاق دینے کے حق سے فقط عورت کو زبردستی طلاق دینا مراد نہیں لیں گے بلکہ انہیں ان معاملات میں اسلام کے تمام قواعد و ضوابط کی پابندی کرنا پڑے گی۔

کیا اسلام نے عورت کے فرائض معین کیے ہیں؟

سوال: اسلامی فقہاء کے فتاویٰ کے مطابق گھر کا کام کاج کرنا اور اسی طرح بچوں کو دودھ پلانا اور ان کی نگہداشت کرنا عورت کے لیے واجب نہیں ہے اور پھر بیوی کے اخراجاتِ زندگی مہیا کرنا بھی شوہر کی ذمہ داری ہے اور اس بنا پر اسے گھر سے باہر کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا نہ تو اس پر کمانا واجب ہے اور نہ ہی خانہ داری۔ اس صورت میں معاشرے میں عورت کا فریضہ کیا ہے؟

جواب: اگر اسلام نے گھر کا کام کاج کرنا اور اسی طرح بچوں کو دودھ پلانا اور ان کی نگہداشت کرنا عورت پر واجب نہیں کیا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کا مقام اور شخصیت معاشرے میں بلند کرے اور یہ کام انجام دینے کے لیے ان کے ہاتھ کھلے چھوڑ دے تاکہ وہ انہیں رضا و رغبت سے کریں اور اگر ان کا معاوضہ لینا چاہیں تو لے سکیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی چیز کے واجب نہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اسے انجام دینے سے روک دیا گیا ہے۔

بلاشبہ اسلام نے عورتوں کی قدر و منزلت بڑھانے کے لیے امور خانہ داری

ان پر واجب نہیں کیے تاکہ ان کی حیثیت ایک کنیز کی ہو کر نہ رہ جائے۔ درحقیقت اس نے اس چیز کو ان کے ضمیر اور فطری خواہش پر منحصر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ مائیں اپنے فرزندوں اور نوزائیدہ بچوں سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ یہی ماستا انہیں اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بدن کا رس انہیں پلائیں اور ان کی پرورش کریں۔ عورتیں گھر کی زیبائش کی طرف طبعی میلان رکھتی ہیں اور یہ میلان بجائے خود گھر کی درستی اور خوشنمائی کا ضامن ہے۔ چنانچہ طلوع اسلام کی چودہ صدیاں گزرنے کو آئی ہیں اور یہی مروّجات مسلمان بیویوں اور شوہروں کے درمیان جاری رہے ہیں۔ مسلمان عورتیں ہمیشہ یہ فطری افعال انجام دیتی رہیں اور ضرورت کے وقت اس قابل بھی رہی ہیں کہ اپنے شرعی حقوق سے استفادہ کر سکیں۔

کیا کائنات اپنی بقا کے لیے خدا کی محتاج ہے؟

سوال: بعض قارئین گرامی کا کہنا ہے کہ آجکل مادہ پرستوں کی جانب سے ایک اعتراض کیا جا رہا ہے جس کا مکمل جواب ہمارے علم میں نہیں۔ براہِ مہربانی اس بارے میں تسلی بخش وضاحت فرمائیں۔ اعتراض یہ ہے کہ:

"ممکن ہے ہم اس بات کو قبول کریں کہ اس جہان کا نظامِ آفرینش اپنی پیدائش کے لیے علم و قدرت کے مالک ایک مبداء کا محتاج تھا لیکن اس نظام کی بقا اور قیام کے لیے اس مبداء کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب اس جہان کے بنانے والے نے اسے نپے تلے طریقے سے علت اور معلول کے خاص نظام کے ساتھ پیدا کیا ہے تو پھر خواہ وہ (بنانے والا) ہو یا نہ ہو یہ وضع خود بخود قائم رہے گی۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کہ ایک صحیح وقت بتانے والی گھڑی کئی سال چلتی رہے لیکن اس کے بنانے والے کا وجود بھی باقی نہ رہا ہو یا ایک فضا میں سفر کرنے والا راکٹ سالہا سال تک فضا میں آگے بڑھتا رہے اور

ہمیں خبریں پہنچاتا رہے جب کہ اس کے بنانے والے ختم ہو چکے ہوں"۔

جواب: یہ کوئی نیا اعتراض نہیں ہے جو آجکل کے مادہ پرستوں نے پیش کیا ہے بلکہ اس کا ذکر پہلے زمانے کے لوگوں نے بھی کیا تھا اور فلسفہ وکلام کی کتابوں میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ بہر حال اس اعتراض کو دو شکلوں میں پیش کیا جا سکتا ہے:

اوّل یہ کہ: ایک موجود جو ایک خاص نظام رکھتا ہو اپنی پیدائش کے آغاز میں علت کا محتاج ہوتا ہے لیکن اپنی بقاء کے لیے (مطلقاً) علت کا محتاج نہیں ہوتا قطع نظر اس سے کہ وہ وہی علت ہو یا اس کے علاوہ ہو۔

یہ وہی بات ہے جس پر بعض گزشتہ فلسفی اعتقاد رکھتے تھے اور تصور کرتے تھے کہ جس طرح ایک عمارت اپنی بقاء کے لیے معمار کی محتاج نہیں ہوتی اسی طرح کسی موجود کو اپنے وجود کے قیام کے لیے علت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اگر اعتراض اس طرح کیا جائے تو اس کا جواب بے حد واضح ہے کیونکہ فلسفیانہ نظریے کے مطابق ایک موجود کی بقا اس کے وجود کے آغاز سے الگ ایک چیز ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہیے کہ ہر چیز کا وجود ہر زمانے میں اس کے وجود کے علاوہ موجود ہوتا ہے۔ وقت کی گزرگاہ میں موجودات کی بقا بالکل ایک دریا کی مانند ہے جس میں پانی کے ذرّے مسلسل بدلتے رہتے ہیں لیکن اس کی ظاہری صورت ویسی کی ویسی باقی رہتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں جس طرح ایک موجود اجزا رکھتا ہے اور اس کا ہر جزو علت کے بغیر موجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ وقت کے لحاظ سے بھی وسعت اور عمر رکھتا ہے جس کا ہر لحظہ علت کا محتاج ہے۔ پس اگر کوئی چیز اپنی حیات کے قیام کے لیے علت کی نیازمند نہ ہو تو اسے اپنے وجود کے آغاز کے وقت کی علت کا نیازمند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وقت کے پہلے اور دوسرے لمحے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ہمیں اجازت دیجیے کہ اس موضوع کی اور زیادہ توضیح کریں:

(حرکت جوہری اور اضافت کی بحث میں) ہمارے قدیم وجدید فلسفیوں کی تحقیقات کے آخری نتیجہ کے مطابق وقت اشیاء کا چوتھا بعد ہے۔ لہٰذا جیسا کہ ممکن ہے کہ طول، عرض

اور عمق کے لحاظ سے دو چیزوں کے بُعد متفاوت ہوں اور ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا ہو۔ اسی طرح وقت کے لحاظ سے بھی ممکن ہے کہ دو چیزوں کے بُعد متفاوت ہوں اور جیسا کہ جسم کے ابعاد میں سے کسی ایک کی کمی و بیشی علت کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی طرح طول وقت کی مقدار اور اشیاء اور حوادث کی عمر بھی علت کی محتاج ہوتی ہے۔

لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ ایک چیز اپنی بقا کے لیے علت کی محتاج نہیں ہے تو یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کہ ہم کہیں کہ سو میٹر کا ایک جسم فقط پہلے میٹر کے لیے پیدا کرنے والے کا محتاج ہے لیکن بقیہ ۹۹ میٹر خود بخود وجود میں آجاتے ہیں۔ کیا کوئی یہ قبول کر سکتا ہے؟

اب جہاں تک "گھڑی اور گھڑی ساز" کی مثال اور ایسی ہی دوسری پُرفریب مثالوں کا تعلق ہے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ گھڑی بھی اپنے وجود کے آغاز اور عمر کے قیام کے لیے علت ہی کی محتاج ہوتی ہے ۔ اپنے وجود کے آغاز کے لیے وہ گھڑی ساز کی محتاج ہے لیکن وجود کے قیام کے لیے اپنی ساخت کے مواد کی خاصیت سے مدد لیتی ہے یعنی اس میں استعمال کی جانے والی دھاتوں کی مضبوطی اسے باقی رہنے کی اجازت دیتی ہے۔ لہٰذا گھڑی کی ساخت کے مواد میں تفاوت کی وجہ سے اس کی عمر کی مقدار میں فرق آجاتا ہے۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ایک چیز کے وجود کے آغاز اور اس کے قیام کو بھی علت کی ضرورت ہوتی ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے ہم فقط ایک نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ جس طرح ایک چیز کے حدوث اور پیدائش کو علت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اس کے قیام اور بقاء کو بھی علت کی ضرورت ہوتی ہے خواہ قیام کی علت پیدائش کی علت ہی ہو یا اس کے علاوہ ہو اور اگر کوئی شخص زندگی کے قیام کے لیے علت کی ضرورت کا انکار کرتا ہے تو وہ قانونِ علت کا کلی طور پر انکار کرتا ہے۔

اب توجہ فرمائیے تاکہ ہم اعتراض کا دوسرا حصہ پیش کریں جو کہ اس کا بنیادی حصہ ہے (غور فرمائیں):

ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر نظام اپنے آغاز اور اپنی زندگی

کے قیام کیلیے بھی علت کا محتاج ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ "حدوث" کی علت ہی "بقا" کی علت بھی ہو۔ اس بات کو کیا امر مانع ہے کہ عالم ہستی کے اصلی مبداء نے اپنے علم اور ارادے کی رو سے اس کائنات کو پیدا کیا ہو اور علت و معلول کے طبیعی سلسلہ کی تنظیم میں انہیں ایک دوسرے سے یوں پیوست کر دیا ہو کہ وہ خود بخود اپنی زندگی کو جاری رکھ سکیں۔ جیسے کہ گھڑی کی مثال میں کہا گیا ہے کہ ایک عاقل شخص اسے مستحکم مواد کی بدولت وجود میں لاتا ہے اور اس کی حیات کے بعد بھی وہ اپنا کام جاری رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عالم ہستی کا نظام اپنے وجود کے آغاز میں خدا کا محتاج تھا لیکن اپنے وجود کو جاری رکھنے کے لیے وہ طبیعی علل اور جبری حرکات کے ایک سلسلے کا مرہون احسان ہے۔

اگر سوال اس شکل میں پیش کیا جائے تو جواب میں یوں کہنا چاہیے (غور فرمائیں):

جب یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ وقت اشیاء کے چوتھے بُعد کی منزل پر ہے یعنی ایک طبیعی موجود اور اس کے آثار ہر لحظہ وجود کا ایک نیا مرحلہ طے کرتے ہیں بلکہ ہر لحظہ پہلے وجود اور بعد والے وجود کے علاوہ وہ ایک نیا وجود ہوتا ہے اور ایک اور تعبیر کے مطابق کائنات "حوادث" اور "ہونی" چیزوں کا مجموعہ ہے تو اس صورت میں ہر لحظے میں ایک طبیعی وجود اور اس کے خواص کے قیام کے لیے ایک علت کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ ایک ایسی علت کے وجود کی جس کی ہستی ازلی اور ابدی ہو۔ ایسی علت کی نہیں جو خود علت کی محتاج ہو۔

ہمیں اجازت دیجیے کہ اس بات کو ایک مثال سے واضح کر دیں:

ایک برقی بلب کو دیکھیے۔ یہ بلب روشن ہونے کے لیے بجلی گھر کا محتاج ہے لیکن کیا یہ ضرورت اسے فقط پہلے لحظے میں ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر کچھ وقت کے لیے —— خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو —— بلب کا رابطہ بجلی گھر سے منقطع ہو جائے تو وہ بجھ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے روشنی اور حرارت کے تمام آثار نابود ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بلب ضروری قوت تاروں سے حاصل کرتا ہو لیکن ظاہر ہے کہ خود تاروں میں تو بجلی نہیں ہوتی اور انہیں بھی یہ قوت بجلی گھر سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اس

کائنات کے تمام موجودات اوران کے خواص اور آثار ایک ایسے مبداء حقیقی کے محتاج ہیں جس پر وہ لحظہ بہ لحظہ تکیہ کرسکیں تاکہ یہ کائنات اپنی ہستی کو باقی رکھ سکے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کائنات کے ان موجودات کی ہستی اوران کے خواص اور آثار خود ان کی ذات کے اندر سے پیدا نہیں ہوئے۔ یہ سب حادثات ہیں (یعنی پیدا کیے گئے ہیں) اور پہلے کچھ نہیں تھے۔ اس کائنات کا نظام طبیعی علل پر تکیہ کرتا ہے لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ یہ طبیعی علل ایک ازلی علت پر تکیہ کریں یعنی یہ لازم ہے کہ انہیں ہستی کا نور لحظہ بہ لحظہ اس جاودانی مبداء سے پہنچتا رہے اور اگر ایک لمحے کے لیے بھی ان کا رابطہ منقطع ہو جائے تو وہ نیست ونابود ہو جائیں گی۔

یہ وہی بات ہے جو ہم کہتے ہیں کہ:

خدا ہمیشہ اور ہر جگہ تمام اشیا اور حوادث کے ساتھ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کائنات کے موجودات اس کے وجود کے بغیر ایک لحظے کے لیے بھی اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے عالم ہستی ایک ازلی اور ابدی عالم نہیں ہے بلکہ ایک حادث عالم ہے جو ایک ازلی اور ابدی وجود سے وابستہ ہے اور یہ وابستگی اس کائنات کی ذات کا اسی طرح جزو ہے جس طرح ایک بلب کی روشنی کی بجلی گھر سے وابستگی اس کی ذات کا جزو ہوتی ہے۔

ایک بہت بڑی غلط فہمی جو گھڑی بنانے کے مسئلے میں پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ گھڑی ساز نے گھڑی کا اصلی مواد ہرگز نہیں بنایا بلکہ اس نے محض اس مواد کو شکل دی ہے اور اس کے پرزوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے لیکن اگر وہ گھڑی کے اصلی مواد بنانے والا ہوتا اور اسے عدم سے وجود میں لایا ہوتا تو اس کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی وہ مواد بھی معدوم ہو جاتا۔

اسی طرح معمار عمارت کا مواد بنانے والا نہیں ہے بلکہ اسے شکل دیتا ہے اور اگر وہ عمارت کا مواد نیستی سے وجود میں لایا ہوتا یعنی وہ مواد اپنی ہستی میں معمار سے وابستہ ہوتا تو معمار کے ختم ہو جانے کے ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہو جاتا۔

اگر ہم اس موضوع کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ دنیا

ممکن الوجود ہے واجب الوجود نہیں۔ اس بنا پر ممکن الوجود اپنے آغاز کے لیے اور اپنی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے واجب الوجود کا محتاج ہوتا ہے اور اگر وہ اپنی زندگی جاری رکھنے میں بے نیاز ہو جائے تو اسے واجب الوجود ہونا چاہیے جب کہ یہ امر محال ہے کہ "ممکن الوجود" واجب الوجود میں تبدیل ہو جائے۔ [۱]

---

[۱] مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "اسلام دین حکمت" مولفہ آیت اللہ بہشتی و حجۃ الاسلام باہنر۔ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی کراچی

چھینک کے بارے میں اسلام کا نظریہ

سوال: کیا اسلام میں یہ حکم وارد ہوا ہے کہ کوئی کام انجام دینے کا ارادہ کرتے وقت اگر کوئی چھینک مار دے تو اس کام کو ملتوی کر دینا چاہیے؟

جواب: اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں اور بنیادی طور پر اسلام کی روح اس قسم کی باتوں سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ وہ تو یہ حکم دیتا ہے کہ اگر تم کوئی کام کرنے کا ارادہ کرو اور اگر اس وقت کوئی شخص فال گیری کرے تو اس کی پروانہ کرو اور خدا پر توکل کرتے ہوئے اس کام میں لگ جاؤ بلکہ اسلام نے تو فال گیری کو شرک کی نشانی قرار دیا ہے۔

البتہ چھینک کے بارے میں یہ حکم وارد ہوا ہے کہ جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو وہ "الحمد للہ" کہے اور تم اس کے حق میں دعا کرو اور کہو "یرحمکم اللہ" (خدا کی رحمت تمہارے شامل حال ہو)۔ اس کے مقابلے میں وہ شخص بھی دعا کرے اور کہے "یغفر اللہ لکم" (خدا تمہیں بخش دے)۔

لیکن کوئی کام کرنے سے رک جانا یا قدرے وقفہ دینا یا ایک چھینک اور دو چھینکوں میں امتیاز کرنا سب بے اصل باتیں ہیں لہٰذا ایک سچے مسلمان کو چاہیے کہ ایسی بیکار باتوں سے پرہیز کرے۔

کیا یہ خوابنامہ صحیح ہے؟

سوال: کبھی کبھی رسولِ اکرمؐ کے آستانِ مقدس کے مجاور کے نام سے خوابنامے نشر کیے جاتے ہیں جن میں لوگوں کو گناہوں سے پرہیز کرنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ کے قول سے ایک سال کی مدت میں امام زمان علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دی جاتی ہے۔ کیا یہ خوابنامے صحیح ہیں؟

جواب: بدقسمتی سے یہ ناپسندیدہ عمل جو بلاشبہ اسلام اور تشیّع کے بعض دشمنوں کی تحریک سے انجام پاتا ہے مسلسل کئی سالوں سے کیا جا رہا ہے اور ہر سال روضۂ رسولؐ کے مجاور جو شاید اس نام و نشان کے ساتھ قطعاً کوئی خارجی وجود نہیں رکھتے ایک تازہ خواب دیکھتے ہیں اور حضرت ولی عصر ارواحنا فداہ کے ظہور کے بارے میں ایک نئی تاریخ متعین کرتے ہیں اور جب وہ خواب غلط ہوتا ہے تو ایک اور خواب دیکھتے ہیں۔

بظاہر یہ خواب گھڑنے والے اپنی خام خیالی کی بنا پہ یہ چاہتے ہیں کہ بعض سادہ لوح لوگوں کو حضرت ولی عصرؑ کے ظہور کے بارے میں متزلزل کر دیں لیکن وہ اس بات سے

غافل ہیں کہ مسلمان (خواہ کتنے ہی سادہ دل کیوں نہ ہوں) ایسی من گھڑت باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ بہرحال اگر بالفرض کوئی ایسے خواب دیکھتا بھی ہے تو مذہبی اصولوں کے نکتۂ نگاہ سے وہ قطعاً معتبر نہیں ہیں۔

کیا "خمس" رسالت کا صلہ ہے؟

سوال: اس میں کوئی شک نہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے سلسلے میں جس جاں فشانی اور فداکاری کا مظاہرہ فرمایا اس کے لیے آپ نے کسی سے کوئی اجر اور صلہ نہیں مانگا اور فقط خدائے تعالیٰ سے اس کا اجر چاہا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آیات مثلاً "آیۂ مودت" میں "آنحضرتؐ کے خاندان سے دوستی" کو مزدِ رسالت کہا گیا ہے تو وہ بھی اس وجہ سے ہے کہ یہ چیز بجائے خود لوگوں پر ایک احسان اور ان کی رہنمائی کا ایک اور ذریعہ ہے کیونکہ "ولایت اہلبیتؑ" اور اس خاندان سے دوستی کا مسئلہ ان کے اقوال اور افعال کی پیروی کا موجب بنتا ہے اور یہ خود ایک قسم کی ہدایت اور سعادت ہے جو اس وسیلے سے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے لیکن خمس کی ادائیگی لوگوں پر واجب کرنا (جس کا نصف سادات کو ملتا ہے) کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا یہ رسالت کا صلہ نہیں ہے؟

جواب: جیسا کہ ہم جانتے ہیں خمس تمام سادات کو نہیں ملتا بلکہ صرف انہیں ملتا ہے جو "محتاج" ہوں اور جو خمس ادا کیا جائے اگر اس کی مقدار سادات کی ضرورت

سے زیادہ ہو تو جو کچھ باقی بچے وہ (ان احکام کے مطابق جو ہم تک پہنچے ہیں) مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کرا دینا چاہیے تاکہ عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جا سکے اسی طرح اگر نادار سادات کی ضروریات خمس کی مقدار سے زیادہ ہوں تو اس کمی کو بیت المال سے پورا کرنا چاہیے۔ اُدھر سادات زکات لینے سے قطعاً محروم ہیں جو دوسرے محتاجوں کا حق ہے (بجز اس کے کہ زکات دولتمند سادات کے مال میں سے لی گئی ہو)۔

لہٰذا درحقیقت خمس بجائے اس زکات کے ہے جو دوسرے حاجتمندوں کو دی جاتی ہے اور اس کے سادات کو دیے جانے کی شرائط بھی تقریباً وہی ہیں جن کے تحت دوسرے فقراء کو زکات دی جاتی ہے لیکن خود آنحضرتؐ کی شان کی حفاظت اور آپ کے بلند مقام کی رعایت کے سبب اس کی ادائیگی ایک اور شکل اور ایک اور نام (یعنی زکات کے بجائے خمس کے نام سے) ہوتی ہے۔ یہ رسولِ گرامی کی ذات والا کے لیے ایک طرح کا ادب اور احترام ہے اور کسی وجہ سے بھی اس میں صلے اور معاوضے کا کوئی شائبہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ بزرگ ہستیوں کے ادب و احترام اور ان کے حفظ مراتب اور صلہ و بدلہ میں بڑا فرق ہے۔

کیا خمس طبقاتی امتیاز کی تقویت کا موجب نہیں؟

سوال: ایک کمیونسٹ لیڈر کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ: "میں نے اس بنا پر تمام مذاہب کا مطالعہ کیا ہے کہ شاید کسی ایک طرف مائل ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے دینِ اسلام کو تمام مذاہب سے برتر پایا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں بھی مجھے ایک کمزور پہلو نظر آیا اور وہ یہ کہ اسلامی قوانین پیغمبرِ اسلام کی آل کو دوسرے مسلمانوں پر فوقیت دیتے ہیں اور خمس ان کے لیے مختص کیا گیا ہے۔"
اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: جیسا کہ اس سے پہلے سوال کے جواب میں کہا گیا ہے کہ اصولی طور پر خمس (جو سادات کا حصہ ہے) اور زکات میں کوئی فرق نہیں یعنی دونوں کا تعلق معاشرے کے محروم اور نادار افراد سے ہے، جو ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیے جاتے ہیں، اور جو بچ جائے وہ بیت المال کا جزو شمار ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ چونکہ آلِ رسولؐ کو ایک طرح کا شرف حاصل ہے اس لیے ان کی ضروریات زکات کے نام سے نہیں بلکہ ایک اور عنوان سے پوری

کی جاتی ہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ سادات آنحضرتؐ سے اس نسبت کی بنا پر احکامِ اسلام سے رتی بھر انحراف نہیں کر سکتے اور عوامی قوانین کی رو سے ان میں اور دوسرے لوگوں میں کوئی فرق نہیں۔

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ جس طرح بعض لوگ خیال کرتے ہیں اس کے برعکس خمس کا قانون سادات کے لیے کوئی طبقاتی امتیاز پیدا نہیں کرتا اور مادی نقطۂ نگاہ سے اس میں اور زکات میں (جو دوسرے فقراء کے لیے ہے) کوئی فرق نہیں ہے یعنی ضرورتمند سادات کو دوسرے ضرورتمندوں کے مقابلے میں کوئی زائد رقم نہیں ملتی اور نہ ہی کھاتے پیتے سادات کو خمس دیا جاتا ہے۔

اس قدر شوق دلانے کے باوجود یہ جہالت کیوں ہے؟

سوال: اگرچہ رسولِ اکرمؐ نے لوگوں کو علم و دانش کی دعوت دی اور جہالت کے خلاف جنگ کرنے اور علم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی، اس کے باوجود آجکل زیادہ تر مسلمان جاہل ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: جب تک مسلمان اسلام کی تعلیماتِ عالیہ سے غافل نہیں ہوتے تھے علم و دانش ان کے درمیان برق رفتاری سے ترقی کر رہے تھے۔ ہمارے اس قول کے گواہ وہ عظیم اسلامی مدارس اور کتب خانے ہیں جن کا ذکر تاریخ کے صفحات میں ملتا ہے۔ اس زمانے میں جب آج کی طرح کاغذ سازی اور چھاپے خانے موجودہ وضع میں موجود نہیں تھے فقط مراغہ کے کتب خانے میں چار لاکھ اور بغداد کے کتب خانہ دار الحکمہ میں چالیس لاکھ کتابیں تھیں اور اسی طرح دوسرے اسلامی ممالک کے کتب خانے بھی کتابوں سے بھرے پڑے تھے۔ یہاں تک کہ اس آخری دور میں بھی یعنی مسلمانوں پر استعماری طاقتوں کے تسلط سے پیشتر مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگوں کی کثرت تھی۔ مثلاً فرانس کے قبضے سے پہلے الجزائر کے تقریباً سب

باشندے پڑھے لکھے تھے لیکن استعماری قبضہ کے بعد جب علمی امور کی باگ ڈور اغیار کے ہاتھوں میں چلی گئی تو معاملہ برعکس ہو گیا۔

ماضی قریب میں جب بعض اسلامی ممالک کے سربراہ باہم دست و گریباں ہو گئے اور غیروں نے بھی نفاق کی اس آگ کو ہوا دی تو مسلمانوں کی بے حسی اور جمود کا دور شروع ہو گیا اور ان کی تہذیب کی توسیع و ترقی رک گئی اور ملتِ اسلامیہ کی اکثریت ان پڑھ رہ گئی اور ان میں سے بیشتر لوگ نوشت و خواند سے بھی محروم ہو گئے۔

ہمیں امید ہے کہ مسلمان ایک دفعہ پھر اسلامی احکام سے فیضان حاصل کر کے اپنی علمی تحریک کو جاری کریں گے جیسے کہ آجکل ان میں بیداری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔

کیا اچھے لوگوں کو بھی نماز پڑھنی چاہیے؟

سوال: ہم جانتے ہیں کہ نماز ہمیں برے کاموں سے روکتی ہے لیکن اگر نماز پڑھے بغیر ہم بُرے کاموں سے اجتناب برتیں تو کیا پھر بھی نماز پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: نماز ایک قطعی اور عمومی حکم ہے اور اگر بالفرض کوئی شخص نماز پڑھے بغیر بُرے کاموں کو ترک کر دے تب بھی وہ اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے اور اسے ضرور نماز پڑھنی چاہیے کیونکہ اگر اس قسم کی بات ہونے لگے تو ممکن ہے کہ بہت سے لوگ اس بہانے سے اس عظیم تربیتی حکم سے پہلو تہی کرنے لگیں۔

علاوہ ازیں خدا کی جانب توجہ دیے بغیر جو اس عظیم مذہبی فریضے کی انجام دہی کا نتیجہ ہے بُرے کام ترک کرنے کی کوئی ضمانت نہیں اور متعدد تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ کسی طرح بھی آلودگی سے پاک نہیں رہ سکتے اور کم از کم بدن، لباس اور غذا کی صفائی اور پاکیزگی کے پابند نہیں ہوتے۔ ان سب باتوں کے علاوہ نماز اور خدا کی جانب توجہ انسان کے ایمان کو پروان چڑھانے اور اس کی روح کی

بتدریج ترقی میں (حتیٰ کہ اس انسان کی روحانی ترقی میں بھی جو گناہوں سے اجتناب برتتا ہو) بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

بہر حال ہر مکلف مسلمان مرد اور عورت پر واجب ہے کہ بلا استثنا فریضۂ نماز کو ادا کرے۔

کیا انسان فرشتوں سے برتر ہے؟

سوال: جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے تو کیا اس سے یہ مراد ہے کہ خدا نے جو موجودات پیدا کیے ہیں انسان ان سب میں کامل ترین ہے حتیٰ کہ فرشتوں سے بھی بالاتر ہے؟

جواب: دوسری تمام موجودات کی طرح انسان اور فرشتے بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انسان غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے جو فرشتوں میں نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں فرشتوں کی تخلیق اس انداز سے ہوئی ہے کہ وہ نفس پرستی سے مبرّا ہیں۔ اس کے برخلاف حیوانات عقل نہیں رکھتے اور فقط شہوت کے مالک ہیں لیکن یہ دونوں قوتیں انسان کی سرشت میں لکھی گئی ہیں۔

چونکہ انسان دو متضاد قوتوں کا مالک ہے اس لیے اس کی ذمہ داری بھی بہت سنگین اور خطرناک ہے۔ لہٰذا اگر انسان عقل کی پیروی کرے اور خدا شناس اور باایمان بن جائے اور اپنی ناجائز خواہشات کو دبا دے تو وہ فرشتے سے برتر ہے اور اگر نفس کا بندہ بن کر عقل کی رہنمائی سے بے نیاز ہو جائے، نیز سچائی، نیکی اور ایمان سے

دوری اختیار کرے تو وہ حیوان سے بھی پست تر ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں کہ جب خدا نے آدمؑ کو پیدا کیا تو تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ انہیں سجدہ کریں اور آدمؑ کو حکم دیا کہ وہ جو کچھ جانتے ہیں فرشتوں کو بتائیں اور درحقیقت انہیں فرشتوں کا معلم بنا دیا۔

لڑکوں اور لڑکیوں کا بالغ ہونا

سوال: فزیالوجی (علم افعالِ اعضا) میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ جسمانی ساخت اور عقلی و فکری قوت کی رو سے عورت اور مرد کے مابین فرق ہے۔ اس کے باوجود اسلام نے لڑکیوں کو ۹ سال کی عمر مکمل ہونے پر بالغ قرار دیا ہے اور ان پر شرعی احکام عائد کر دیے ہیں لیکن لڑکوں کا سن بلوغت ۱۵ سال کی عمر مکمل ہونے کو قرار دیا ہے۔ اس حکم کے پیچھے کیا فلسفہ کارفرما ہے؟

جواب: علمی تحقیقات سے جو کچھ ثابت ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں جلدی بڑھتی ہے۔ لہٰذا جو دورہ مرد پندرہ سال کی مدت میں مکمل کرتا ہے اسے عورت صرف نو سال میں طے کر لیتی ہے اور یہ بات صرف عورت اور مرد کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام جانداروں اور نباتات میں کمزور تر انواع اپنی نشوونما کا آخری مرحلہ تھوڑی مدت میں طے کر لیتی ہیں مثلاً نیلوفر کی نشوونما چنار کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ کوئی موجود جتنا نازک ہو اس کی نشوونما اتنی ہی زیادہ تیزی سے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سی لڑکیاں ۱۳ یا ۱۴ سال کی عمر میں ماں بننے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ جب کہ لڑکے عموماً اس عمر میں باپ بننے کے قابل نہیں ہوتے۔

مراجع دینی کی تقلید

سوال : ہمارے درمیان کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جو احکام اسلام میں تقلید کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں اور یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ امر سب لوگوں پر واجب ہے کہ وہ دینی مسائل میں تحقیق کریں اور بلا امتیاز تمام مذہبی مسائل قرآن مجید اور دیگر اسلامی علوم سے اخذ کریں کیونکہ :

۱۔ قرآن مجید ہر قسم کی تقلید کے خلاف ہے اور بے سوچے سمجھے کسی کی پیروی کرنے پر ہمیشہ سے معترض ہے۔

۲۔ تقلید ایک بلا دلیل تابعیت ہے اور عقل و شعور ایسی پیروی کو پسند نہیں کرتے۔

۳۔ تقلید مسلمانوں میں پراگندگی کا باعث ہے کیونکہ مراجع تقلید عموماً کئی ایک ہوتے ہیں اور ان کی آراء تمام مسائل میں یکساں نہیں ہوتیں۔

جواب : ہمارا خیال ہے کہ ان تمام اعتراضات کا سرچشمہ صرف ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ : لفظ 'تقلید' کے دو معنی ہیں۔ ایک تو عام معنی ہیں جو روزمرہ کی گفتگو میں لفظ 'تقلید' سے مراد لیے جاتے ہیں لیکن اس کے ایک علمی معنی بھی

ہیں جن سے فقہ اور اصول کی کتابوں میں بحث کی جاتی ہے۔ سابقہ اور موجودہ تمام اعتراضات انہیں پہلے معنی پر ہیں جبکہ دوسرے معنی کا پہلے معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ روزمرہ کی گفتگو میں تقلید ان بے ڈھنگے کاموں کو کہا جاتا ہے جو اکثر لوگ بغیر دیکھے سنے دوسروں کی دیکھا دیکھی کرتے ہیں اور ان کے غلط اعمال کی نقل اتارتے ہیں اور جاہل افراد کی اپنے ہی جیسے جاہل لوگوں کی یہ پیروی یقینی طور پر ایک بدترین اور مکروہ عمل ہے، جو نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ ہی اسلامی تعلیمات کی روح سے سازگار ہے اور کوئی بھی عقلمند انسان اس بات پر تیار نہیں ہوتا کہ آنکھیں بند کیے ہر کس و ناکس کا اتباع کرے۔

یہ وہی تقلید ہے کہ بت پرست اپنے اعمال کی توجیہ کی خاطر جس کا سہارا لیتے تھے اور کہتے تھے کہ بت پرستی ہمارے بزرگوں کا طریقہ ہے اور ہم ان کی پیروی سے چشم پوشی کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

قرآن مجید ان کی منطق کا ذکر مندرجہ ذیل آیت میں کرتا ہے:

"ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اس طریقے پر پایا ہے اور ہم بھی ان کی تقلید کریں گے۔" [1]

وہ اپنے اس احمقانہ فعل (لکڑی اور پتھر کے مجسموں کی پرستش) کی انجام دہی کے لیے اپنے باپ دادا کے جاہلانہ طریقے پر تکیہ کرتے تھے اور آنکھ، کان بند کر کے ان کی لایعنی روش کی پیروی کرتے تھے۔ یہ وہی تقلید ہے جو بہت سی معاشرتی خرابیوں یعنی ریس، فیشن پرستی اور بدکرداری وغیرہ کے پھیلاؤ کا سبب ہے۔

مولانا رومی کے اس مصرعے میں ایسی ہی تقلید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"خلق را تقلید شان بر باد داد"

---

[1] سورۂ زخرف۔ آیت ۲۳

(لوگوں کو ان کی احمقانہ تقلید نے برباد کر دیا)۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ وہ تمام اعتراضات جو نا واقف لوگ تقلید کے مسئلے پر کرتے ہیں انہیں عام معنوں پر مبنی ہیں لیکن علمی اصطلاع میں تقلید کا مفہوم اس سے بالکل جدا ہے اور اس کا خلاصہ اس جملے میں ادا کیا جا سکتا ہے:

"مخصوص مسائل میں تخصص نہ رکھنے والے شخص کا متخصص اشخاص سے رجوع کرنا"

یعنی وہ لوگ جو ان علمی مسائل سے واقفیت نہ رکھتے ہوں کہ جن میں تخصص کی ضرورت ہو اور ان سے آگاہی سالہا سال کے مطالعہ پر منحصر ہو تو وہ ضرورت کے وقت جامع الشرائط مجتہدین سے رجوع کریں اور ان کے فتاوی پر عمل کریں۔ ان معنوں میں تقلید جس کی جانب علمی کتابوں میں اشارہ ہوا ہے اور جسے بعض اوقات "مراجعہ غیر عالم بہ عالم" (غیر عالم کا عالم سے رجوع کرنا) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تمام صنعتی، زرعی، طبی اور انہیں جیسے دوسرے مسائل میں انسانی زندگی کی بنیاد ہے۔

اگر کسی وقت یہ چیز انسانی زندگی میں سے نکال دی جائے یعنی کوئی مریض ڈاکٹر کے پاس نہ جائے، قانونی مسائل میں کوئی شخص وکیلوں سے مشورہ نہ کرے، کوئی انسان انجینئروں اور معماروں سے رجوع نہ کرے اور کوئی شخص کسی کاریگر، مکینک اور مختلف شعبوں کے ماہرین کی خدمات حاصل نہ کرے تو ساری اجتماعی زندگی درہم برہم ہو کر رہ جائے اور اس کا ہر شعبہ ابتری کا شکار ہو جائے۔

دینی مسائل بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بلاشبہ دینی عقائد کے اصول یعنی توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت کے بارے میں سب لوگوں کو تحقیق کرنی چاہیے اور ان کی تحقیق کرنا کوئی مشکل اور پیچیدہ کام نہیں ہے اور ہر شخص ان چند بنیادی چیزوں کو اپنے فہم اور معلومات کے مطابق دلیل اور ثبوت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے لیکن جن مسائل کا تعلق اسلامی عبادات، معاملات اور سیاست کے بارے میں احکام یعنی نماز، روزہ اور جہاد، حدود و تعزیرات، قصاص و دیت، نکاح و طلاق اور دیگر ہزارہا مسائلِ زندگی

سے ہو ان میں تمام افراد شخصی طور پر ہرگز تخصص حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ان کے متعلقہ احکام کے بارے میں دینی منابع (قرآن، حدیث، دلیلِ عقل اور اجماع) سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

لہٰذا لوگوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس قسم کے مسائل کے بارے میں صاحبِ نظر بزرگ مجتہدین سے رجوع کریں جنہوں نے سالہا سال تک اسلامی مسائل کے سلسلے میں محنت کی ہے اور جو کتابِ الٰہی سنتِ رسولؐ اور آئمہ اہلبیتؑ کے آثار و اقوال سے کامل واقفیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیانات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مجتہدین سے اس قسم کا مراجعہ ان کی بلا دلیل پیروی کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ یہ تقلید اور استفادہ ہمیشہ ایک عقلی اور منطقی دلیل سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ:

"ایک عالم، دانشمند اور متخصص شخص کا نظریہ، بالخصوص اس صورت میں جب کہ وہ بے ضرر بھی ہو حقیقت سے بہت نزدیک ہوتا ہے اور عموماً حقیقت سے جدا نہیں ہوتا۔"

اور اگر اس میں کوئی غلطی بھی ہو تو اس کی غلطیاں محدود ہوتی ہیں جب کہ ایک غیر عالم شخص اگر اپنی مرضی اور ذاتی نظریے کے مطابق عمل کرنا چاہے تو اس کے تمام اعمال سراسر غلط ہوں گے۔

مثلاً جب ایک بیمار انسان ڈاکٹر کے پاس جائے تو عموماً نسخہ لیتا ہے اور ممکن ہے کہ ڈاکٹر اس میں غلطی کا شکار ہو جائے لیکن اس کی غلطیاں یقیناً ان مثبت نتائج کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہیں جو اس کے نسخے سے برآمد ہوتے ہیں (یہاں ڈاکٹر سے مراد قابل اور سوجھ بوجھ رکھنے والے ڈاکٹر ہیں)۔

لیکن اگر انسان ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کو ترک کر دے اور جب کبھی بیمار ہو تو اپنی مرضی سے جو دوائی جی میں آئے وہی پی لے تو بلاشبہ وہ ایک بڑے خطرناک فعل کا مرتکب ہوتا ہے اور اپنی جان خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

نتیجہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ ناواقف افراد کا واقفکار افراد کی پیروی کرنے کا عمل ایک اجمالی اور عقلی دلیل سے وابستہ ہوتا ہے۔

یہ بھی مسلّم ہے کہ اس قسم کی پیروی اور استفادہ انسان کی بے بضاعتی کی علامت نہیں بلکہ اس کی اہلیت کا ثبوت ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ علوم کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ فقط ایک علم میں تخصص کی بیسیوں اور بعض اوقات سینکڑوں شاخیں ہوتی ہیں اور اگر کوئی شخص نوح کی عمر اور بوعلی سینا کا دماغ بھی رکھتا ہو تو وہ علوم کے ۱۰۰ ویں حصے میں بھی تخصص حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ جن شعبوں میں اسے تخصص حاصل نہ ہو ان کے بارے میں دوسروں سے رجوع کرے۔

مثلاً جب انجینئر بیمار ہو تو وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور جب ڈاکٹر اپنا مکان تعمیر کرنا چاہے تو وہ اپنے رفیق انجینئر سے رجوع کرتا ہے تاکہ اس سے نقشہ تیار کرائے اور جب ان دونوں کی موٹر کاریں خراب ہو جائیں تو وہ موٹر مکینک سے استفادہ کرتے ہیں، نیز وہ جن مذہبی احکام سے واقف نہیں ہوتے ان کے بارے میں علمائے دین سے رجوع کرتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب انسان ضروری مسائل کے بارے میں علماء سے رجوع کرے تو ان سے ہر مسئلے کی دلیل دریافت کرنے میں کیا حرج ہے؟

لیکن یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ:

اس میں کیا حرج ہے کہ جب ایک مریض ڈاکٹر کے پاس جائے تو اس سے نسخہ میں درج ہر دوائی اور اس کی ترکیب استعمال کے بارے میں دلائل طلب کرے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ڈاکٹر مریضوں کے سامنے اپنے نسخوں کی تشریح کریں اور اگر بالفرض وہ ایسا کریں بھی تو جو شخص علم تشریح، علم عضویات اور دواؤں کے خواص اور ان کے ردِّ عمل سے آگاہ نہ ہو وہ ڈاکٹر کی وضاحت سے کیا کچھ سمجھ پائے گا اور کیسے فیصلہ کرے گا۔

جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ اسلامی علوم کی وسعت سے قطعاً واقف نہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ قرآن مجید اور لاکھوں احادیث کی تمام جزئیات کو سمجھنے

روایانِ حدیث کے حالات کے مطالعہ اور احادیث میں سے درست کو نادرست سے شناخت کرنے نیز آیاتِ قرآن اور سنتِ رسولؐ کی تفاسیر کے ادراک کے لیے لمبی مدت درکار ہے تاکہ انسان ان میں تخصص حاصل کر سکے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک اسلامی حکم کے سمجھنے کے لیے جس کا تعلق ازدواج، طلاق اور بچوں کی پرورش اور تربیت وغیرہ سے ہو، قرآن مجید کی کئی آیات اور بیسیوں احادیث دیکھنا پڑتی ہیں اور پھر کتبِ رجال سے بیسیوں روایانِ حدیث کے حالات کا بغور مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور جو متعدد الفاظ احادیث میں آئیں انہیں لغت کی مختلف کتابوں کی مدد سے سمجھنا پڑتا ہے اور ان کا محلِ استعمال ادبیاتِ عرب سے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ کیا واقعی تمام لوگ اسلامی مسائل سے متعلقہ ان تمام چیزوں کی جزئیات سے آگاہ ہو سکتے ہیں؟ کیا مذکورہ بات کہنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر فقط دینی علوم کی تحصیل میں لگ جائیں، جب کہ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان سب افراد میں درجہ اجتہاد پر پہنچنے کی قابلیت اور احکامِ شرعی کے استنباط کا ذوق ہے بھی یا نہیں؟ اور ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سے افراد کی صلاحیتیں مختلف ہوں۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ مراجع تقلید سے رجوع کرنا اختلاف اور پراگندگی کا موجب ہے یہ بڑی عجیب بات ہے کیونکہ:

۱۔ ہر زمانے میں تقلید کے لیے معروف مراجع عموماً ایک یا چند اشخاص ہوتے ہیں لیکن اگر سبھی مسلمان اسلامی احکام کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیں تو مسلمانوں کی تعداد کے پیشِ نظر گوناگوں آراء پیدا ہو جائیں گی اور یہ چیز غیر معمولی اختلاف اور پراگندگی کا موجب ہوگی۔

۲۔ علماء کے مابین صرف تیسرے اور چوتھے درجے کے مسائل میں اختلاف ہے لیکن اصولی اور بنیادی مسائل میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو افراد مختلف علماء کی پیروی کرتے ہیں اور وہ سب مل کر ایک

واحد میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اور جزئی مسائل میں فتاوی کا اختلاف ان کی جماعت میں ہم آہنگی سے مانع نہیں ہوتا یا یہ کہ سب حج کو جاتے ہیں اور معین ایام میں اراکم حج انجام دیتے ہیں اور فتاویٰ کا اختلاف ایک کاروان کے افراد تک کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا

یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ فتاوی کا اختلاف ان مسائل میں ہے جن سے مسلمانوں کی وحدت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

دو اہم احکام

سوال: "تولا" اور "تبرا" جو ہمیں شروع ہی سے بطور دو اسلامی احکام کے سکھائے گئے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے؟ اور کیا موجودہ زمانے میں بھی ان پر عمل کیا جا سکتا ہے

جواب: عموماً اسلام کو ایک ایسے بار آور درخت سے تشبیہ دی جاتی ہے، کہ جس کے بنیادی عقائد سے اس کی جڑیں یعنی اصول اور اس کی عبادات کے وسیع لائحہ عمل سے اس کی شاخیں یعنی فروع تشکیل پاتے ہیں اور فروع کے زیر عنوان عموماً دس چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تاہم اسلام کے اعمال و عبادات کا سلسلہ بڑا وسیع ہے اور وہ ان دس موضوعات پر منحصر نہیں ہے لیکن ان دس احکام کی اہمیت کے پیش نظر انہیں صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔

ان دس احکام میں سے تین (نماز، روزہ اور حج) کا تعلق عبادات، دعاؤں اور خدا سے رابطہ قائم کرنے سے ہے۔ دو (زکات اور خمس) اقتصادی مسائل اور خلق خدا سے تعلقات سے مربوط ہیں اور پانچ (جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر

تولاّ اور تبرا) کا تعلق اجتماعی، عسکری اور سیاسی مسائل سے ہے۔

اس وقت موضوعِ بحث دو آخری احکام یعنی تولاّ (محبت کرنا) اور تبرّا (بیزاری کا اظہار کرنا) ہیں یعنی ہم کس سے محبّت کریں اور کس سے نفرت کریں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خدائے تعالٰے کے دوستوں، حق طلب لوگوں، نیک انسانوں اور حق اور عدالت کے حامیوں سے محبت کریں اور بدکاروں، ظالموں، عیش پرستوں، خدائے تعالٰے اور بنی نوعِ انسان کے دشمنوں سے نفرت کریں۔

ہم سب سے محبت کیوں نہ کریں؟ ہم ساری خلقِ خدا کے لیے اچھے بن کر کیوں نہ رہیں؟ کیا موجودہ دور میں ہر ایک کے ساتھ اور ہر جگہ صلح جویانہ زندگی گزارنے کے اصول کو فراموش کیا جا سکتا ہے؟ لیکن جو لوگ ہر ایک سے اور ہر حالت میں دوستانہ برتاؤ کے طرفدار ہیں ہمیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ:

ایک ایسی دنیا کہ جس میں ظالم اور مظلوم، ستمگر اور ستمدیدہ، جابر اور کمزور، حق طلب اور غاصب، پاک اور ناپاک سب موجود ہوں، کیا ہم سب سے محبت کریں؟ کیا ہم سب کے ساتھ خوش رہیں؟ کیا ہم سب کی مدد کریں؟ کیا کوئی انسانی منطق ہمیں اس بات کی اجازت دے سکتی ہے؟ کیا لوگوں کا زندہ ضمیر اس غلط میل ملاپ سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے؟

یہ دو اصول اسلام کے ضابطۂ عمل کے بنیادی اصولوں میں اس لیے شامل کیے گئے ہیں تاکہ سچائی، عدالت، آزادی، پاکیزگی اور اچھائی کے طرفدار اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر لیں اور ناپاک، ستمگر اور بدکار لوگ تنہا رہ جائیں اور ایک طرح سے اچھے اور نیک لوگوں کے اجتماعی اور اخلاقی محاصرے میں ہوں۔

کیا انسان کا بدن ہر غذا قبول کر لیتا ہے؟ کیا انسانی ذائقہ مفید غذاؤں کو مضر غذاؤں سے الگ کرنے کے لیے "تولا" اور "تبرّا" کا ایک ذریعہ نہیں ہے؟

کیا زہریلی غذائیں کھاتے وقت یا ہیضہ میں مبتلا ہونے پر معدہ ان غذاؤں کو قبول کر کے انسان کو موت سے ہمکنار کر دیتا ہے یا "قے" کی شکل میں زہریلی غذا سے

نفرت کا اظہار کرتا ہے اور اسے اگل دیتا ہے؟

کیا جذب و دفع یعنی ردّ و قبول کی دو قوتوں میں برابری ہی بقائے عالم کا باعث نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر انسانی معاشرہ ان دو قوتوں کے توازن سے جو "تولا" اور "تبرا" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے کیونکر مستثنیٰ رہ سکتا ہے۔

اگر ان دو احکام پر عمل کرنے کی بجائے ہر شخص اور ہر مکتب سے مصالحت کرلی جائے، ہر چیز اور ہر ماحول سے سازگاری کی کیفیت پیدا ہو جائے اور انسانی معاشرہ مفید چیزوں سے نزدیکی اور مضر چیزوں سے دوری اختیار نہ کرے تو وہ بہت جلد تباہ ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی:

"ایمان کا سب سے مضبوط سہارا خدا کے لیے دوست رکھنا اور خدا کے لیے نفرت کا اظہار کرنا ہے۔"

کیا امیر المومنینؑ نے اپنی خلافت پر حدیثِ غدیر سے استدلال کیا؟

سوال : جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ غدیر کے دن رسولِ اکرمؐ نے امیر المومنینؑ کی جانشینی اور خلافت کا اعلان فرمایا اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری سب مسلمانوں پر واجب کر دی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ :

"جب امیر المومنینؑ کی جانشینی کا اس دن اعلان ہو گیا تو پھر امام علیہ السلام نے اپنی تمام عمر میں اپنی خلافت کے اثبات کے لیے اس حدیث سے کیوں استدلال نہ کیا؟"

جواب : جو کچھ سوال میں فرض کیا گیا ہے اس کے برعکس امام علیہ السلام نے اپنی زندگی میں متعدد بار اپنی حقانیت اور خلافت پر حدیثِ غدیر سے استدلال کیا ہے۔ آپ موقع کی مناسبت سے اپنے مخالفین کو حدیثِ غدیر سناتے تھے اور یوں لوگوں کے دلوں میں اپنی وقعت کا نقش ثبت فرمایا کرتے تھے۔ فقط امام علیہ السلام نے ہی نہیں بلکہ رسولِ اکرمؐ کی دختر گرامی حضرت فاطمہؑ، ان کے فرزند گرامی حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور سید الشہداء حضرت امام حسینؑ

نے اور کئی ایک بزرگ اسلامی شخصیتوں مثلاً عبداللہ بن جعفر، عمار یاسر، اصبغ بن نباتہ، قیس بن سعد، عمر بن عبدالعزیز اور عباسی خلیفہ مامون نے حتیٰ کہ آپ کے کچھ مخالفین مثلاً عمرو بن عاص وغیرہ نے بھی حدیثِ غدیر سے استدلال کیا ہے۔

لہٰذا حدیثِ غدیر سے استدلال خود امیر المومنین علیہ السلام کے وقت سے ہوتا رہا ہے اور ہر دور میں آپ کے عقیدتمندوں نے حدیثِ غدیر کو آپ کی امامت اور ولایت کے دلائل میں شمار کیا ہے۔ ہم یہاں اس استدلال کے چند نمونوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ شوریٰ کے دن (شوریٰ کے ارکان کا تعین خلیفۂ دوم کے حکم سے کیا گیا تھا اور ارکان کی ترکیب کچھ یوں تھی کہ سبھی سمجھ رہے تھے کہ خلافت حضرت علیؑ کے علاوہ کسی اور کو ملے گی) جب خلافت کی گیند عبدالرحمٰن بن عوف کی جانب سے عثمان کی طرف پھینکی گئی تو امامؑ نے شوریٰ کی رائے کو باطل ثابت کرنے کے لیے تقریر کی اور کہا:

"میں تم سے ایک ایسی بات سے استدلال کرتا ہوں کہ جس کا تم میں سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔"

پھر فرمایا:

میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے کہ جس کے بارے میں پیغمبرؐ نے فرمایا ہو کہ:

"جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔ اے پروردگار! جو علیؑ کو دوست رکھے اسے دوست رکھ اور جو علیؑ کی مدد کرے اس کی مدد کر۔ اور یہ بات حاضرین ان لوگوں تک پہنچا دیں جو غیر حاضر ہیں۔" [1]

---

[1] مناقب خوارزمی۔ صفحہ ۲۱۷ وغیرہ

اس موقع پر ارکان شوریٰ نے تصدیق کی اور کہا کہ یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی کو بھی حاصل نہیں۔

بلا شبہ حدیثِ غدیر سے امامؑ کا استدلال اسی موقع تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ دوسرے مواقع پر بھی آپ نے اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے جن کی جانب ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

۲۔ ایک دن امیر المومنینؑ کوفہ میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ تقریر کے دوران آپ نے منہ لوگوں کی جانب کیا اور فرمایا:

"میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں تم میں سے جو شخص غدیر میں موجود رہا ہو اور اس نے اپنے کانوں سے سنا ہو کہ پیغمبرؐ نے مجھے اپنی جانشینی کا شرف بخشا وہ کھڑا ہو جائے اور شہادت دے۔ لیکن فقط وہ اشخاص کھڑے ہوں جنہوں نے یہ بات رسولِ اکرمؐ سے خود اپنے کانوں سے سنی ہو اور وہ نہیں جنہوں نے دوسروں سے سنی ہو۔"

اس موقع پر تیس افراد اپنی جگہ پہ کھڑے ہو گئے اور حدیثِ غدیر سننے کے بارے میں گواہی دی۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس دن واقعۂ غدیر کو پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور رسولِ اکرمؐ کے بعض صحابی اس وقت کوفہ میں نہ تھے یا اس سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے اور ممکن ہے کہ بعض اشخاص نے مختلف وجوہ کی بنا پر گواہی دینے سے کوتاہی برتی ہو ورنہ گواہوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔

مرحوم علامہ امینی نے اس حدیث کے متعدد مصادر اپنی نفیس کتاب میں درج کیے ہیں۔ خواہشمند حضرات اس کتاب سے رجوع کر سکتے ہیں۔[۱]

۳۔ عثمان کے دورِ خلافت میں ایک دن مہاجرین اور انصار پر مشتمل دو صد

---

[۱] الغدیر۔ جلد ۱ صفحات ۱۵۳-۱۷۱

بزرگوار مسجد نبویؐ میں جمع تھے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔ دوران گفتگو قریش کی فضیلت، سبقت اور ہجرت کی بات چل نکلی چنانچہ قریش کا ہر قبیلہ اپنی ممتاز شخصیتوں پر فخر کا اظہار کرنے لگا۔

یہ مجلس دن کی ابتدائی ساعات میں شروع ہوئی اور ظہر تک جاری رہی۔ اس دوران میں بہت سے لوگوں نے باتیں کیں لیکن امیرالمومنینؑ فقط ان کی باتیں سنتے رہے اور کچھ نہیں بولے۔ اس موقع پر اچانک لوگوں نے آپ سے مخاطب ہو کر استدعا کی کہ آپ بھی کچھ ارشاد فرمائیں۔

امام علیہ السلام لوگوں کے اصرار پر اٹھ کھڑے ہوئے اور رسولِ اکرمؐ سے اپنے رشتے اور اپنی سابقہ خدمات کے بارے میں گفتگو کی۔ اس دوران آپ نے فرمایا:

"تمہیں یاد ہوگا کہ غدیر کے دن اللہ نے رسولِ اکرمؐ کو حکم دیا کہ جس طرح آپ نے نماز، زکات اور مراسم حج کے احکام لوگوں پر واضح کر دیے ہیں اسی طرح مجھے لوگوں کا پیشوا قرار دیں۔

اور اسی امر کی انجام دہی کے لیے پیغمبر اکرمؐ نے ان الفاظ میں خطبہ ارشاد فرمایا:

"خدائے تعالیٰ نے مجھے ایک کام کے انجام دینے کا حکم دیا ہے اور میں ڈرتا تھا کہ مبادا کچھ لوگ خدا کا پیغام پہنچانے کے بارے میں میری تکذیب کریں لیکن خدائے تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں وہ پیغام پہنچا دوں اور اس نے مجھے یہ تسلی بھی دی ہے کہ وہ مجھے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

ہاں! اے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ خدا میرا مولا ہے اور میں مومنوں کا مولا ہوں اور میں ان کے لیے خود ان سے بھی برتر ہوں!"

اس موقع پر نبی اکرمؐ نے فرمایا:

"علی! اٹھو۔ اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر آپ نے اپنا منہ لوگوں کی جانب کیا اور فرمایا:

"جس کا میں مولا ہوں اس کا علی بھی مولا ہے۔ خداوندا! اسے

دوست رکھ جو اسے دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو اسے دشمن رکھے۔"

اس موقع پر سلمانؓ فارسی نے رسولِ اکرمؐ سے پوچھا:

"علیؑ ہم پر کس قسم کی ولایت رکھتے ہیں؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"تم پر علیؑ کی ولایت اسی طرح ہے جس طرح تم پر میری ولایت ہے میں جس کی جان پر تصرف رکھتا ہوں علیؑ بھی اس کی جان پر تصرف رکھتے ہیں۔"[1]

۴۔ یہ صرف حضرت علیؑ ہی نہیں ہیں جنہوں نے اپنے مخالفین کے جواب میں حدیثِ غدیر سے استدلال فرمایا ہے بلکہ رسولِ اکرمؐ کی دخترِ گرامی قدر نے ایک تاریخی دن کو اپنا حق حاصل کرنے کے لیے گفتگو فرمائی تو صحابۂ رسولؐ سے مخاطب ہو کر کہا:

"کیا تم غدیر کا دن بھول گئے ہو پیغمبرؐ نے علیؑ کے لیے فرمایا:

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ"

۵۔ جب امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کرنے کا فیصلہ کیا تو کھڑے ہو کر ان الفاظ میں خطبہ ارشاد فرمایا:

خدائے تعالٰے نے اسلام کے وسیلے سے اہلبیتِ پیغمبرؐ کو عزیز رکھا۔ اور ہمیں منتخب فرمایا اور ہمیں ہر قسم کی نجاست سے پاک کیا۔

---

[1] فرائد السمطین باب ۵۸۔ امیرالمومنینؑ نے ان تین مواقع کے علاوہ 'یوم الرحبہ' نامی دن کو کوفہ میں اور "جمل" کے دن اور "حدیث الرکبان" نامی حادثہ میں اور ان کے علاوہ جنگ صفین میں بھی اپنی خلافت پہ حدیثِ غدیر سے استدلال فرمایا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:
ساری امت نے سنا کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو مخاطب کر کے کہا:
"تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰؑ سے تھی۔"
سب لوگوں نے دیکھا اور سنا کہ غدیر خم میں پیغمبرؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور لوگوں سے کہا:

جس کا میں مولا ہوں پس علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔ خداوندا! اسے دوست رکھ ...... [1]

۴۔ حضرت امام حسینؑ نے بھی سرزمینِ مکہ میں ایک بہت بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے جس میں بہت سے صحابۂ رسولؐ بھی موجود تھے یوں ارشاد فرمایا:
"میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تمہیں علم ہے کہ غدیر خم میں پیغمبرؐ نے علیؑ کو خلافت اور ولایت کے لیے منتخب کیا اور فرمایا: جو حاضر ہیں وہ (یہ پیغام) ان تک پہنچا دیں جو غیر حاضر ہیں۔"
ان سب نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں۔
علاوہ ازیں کئی ایک اصحابِ رسولؐ مثلاً عمار یاسر، زید بن ارقم، عبداللہ بن جعفر، اصبغ بن نباتہ رضوان اللہ علیہم اور دوسرے افراد امام علی علیہ السلام کی خلافت اور ولایت کے بارے میں اس حدیث سے استدلال کرتے تھے۔ [2]

---

[1] ینابیع المودۃ صفحہ ۴۸۲۔ [2] ان احتجاجات کے مدارک و مصادر کے بارے میں مزید معلومات کے لیے "الغدیر" (جلد ا۔ صفحات ۱۴۶-۱۹۵) سے رجوع کریں۔ اس کتاب میں مدارک متعین کرتے ہوئے ۲۲ احتجاج نقل کئے گئے ہیں۔

کیا ایثار و قربانی ممکن ہے؟

سوال: کہا جاتا ہے کہ انسان کے تمام افعال کوئی مادی یا روحانی فائدہ حاصل کرنے یا اپنے جسم اور روح کو کسی ضرر سے محفوظ رکھنے کی غرض سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کے ایسے کام بھی جن کی نوعیت نیک جذبات اور انسان دوستی پر ہوتی ہے (مثلاً بینواؤں کی اعانت اور فرزندوں کی تربیت) وہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہیں کیونکہ انسان دوسروں کی مدد اور ان سے محبت کے اظہار سے اپنی مضطرب روح کو سکون بخشتا ہے اور اپنے آپ کو اس ذہنی کرب سے نجات دلاتا ہے جو ان پر درد مناظر کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔

اس اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ انسان کے تمام افعال کا محرک جسمانی اور ذہنی منفعت طلبی کا جذبہ ہوتا ہے' اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض کاموں کو ایک طرح کا ایثار' فداکاری' جانبازی اور بے نفسی شمار کیا جاتا ہے؟

ماں کی مامتا جانبازی اور فداکاری کا بہترین مظہر ہے اور ماں اپنے فرزند

سے اپنی فطری محبت کا اظہار کر کے سکون حاصل کرتی ہے اور اگر وہ بچے کی پرورش اور تربیت نہ کرے تو اسے اذیت ہوتی ہے۔ اس صورت میں ماں کی محبت کو ہر قسم کی آلائش سے پاک محبت کیسے شمار کیا جا سکتا ہے اور اس کے عمل کو حقیقی جانبازی اور فداکاری کا نام کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب دو طرح دیا جا سکتا ہے:

۱۔ "ایثار" اور "قربانی" سے مراد یہ ہے کہ انسان کوئی کام کسی فرد یا معاشرے سے کسی بدلے کی توقع رکھے بغیر انجام دے۔ اس کے مقابلے میں وہ کام ہوتا ہے جو معاملے اور معاوضے کا پہلو رکھتا ہو اور انسان اسے مادی منافع حاصل کرنے کے لیے انجام دیتا ہو۔

فرض کیجیے کوئی ایسا شخص ہو جسے بینواؤں اور یتیموں کی اندوہناک حالت دیکھ کر سخت دکھ ہوتا ہو یا ان لوگوں کی مدد کر کے وہ مسرت محسوس کرتا ہو اور جب یہ شخص کسی ریاکاری یا ظاہرداری کے بغیر اپنے مال کا کچھ حصہ جو اس کی ضرورت سے زائد بھی نہ ہو ان لوگوں کو دیدے تو ایسے موقع پر اس کے عمل کو "ایثار" اور "بے نفسی" کہا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ کام اسے ضمیر کی پیہم ضربوں سے آزاد کر دیتا ہے اور اسے خوشی اور مسرت بخشتا ہے لیکن چونکہ اس عمل کا محرک کوئی دنیاوی فائدہ نہیں ہوتا اور معاوضے کی خواہش اسے اس فعل پر آمادہ نہیں کرتی لہٰذا اس کا یہ کام عقل اور شرع کی رو سے شائستہ ترین کام اور ایک قسم کی فداکاری شمار کیا جاتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ آیا ایک فعل کو "ایثار" اور "فداکاری" کا نام دیا جا سکتا ہے یا نہیں اس کے محرکات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ وہ جذباتی اور انسانی کام جنہیں بعض اوقات "ایثار"۔ "فداکاری" اور "جانبازی" سے تعبیر کیا جاتا ہے اس قسم کے کام ہوتے ہیں جس میں کوئی حساب کتاب مدنظر نہیں ہوتا اور انہیں انجام دیتے وقت انسان کی نظر کسی مادی فائدے پر نہیں ہوتی اور کام کے محرکات اس کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ وہ ترغیب اور ستائش یا ظاہرداری اور ریا کے بغیر اور کسی فرد یا

معاشرے سے فائدے کی توقع سے قطع نظر کرکے اس کام کو انجام دیتا ہے۔

لیکن جب کوئی کام انجام دیتے ہوئے مادی فوائد کو نظر انداز نہ کیا جائے اور اس عمل کا محرک کسی فرد یا معاشرے کی جانب سے مادی فائدے کی توقع ہو تو اس صورت میں اس کام کو ایک طرح کے لین دین کا نام دینا چاہیے اور اس کام کے کرنے والے کو ایک کاروباری انسان تصور کرنا چاہیے۔

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ کسی چیز یا کسی شخص سے عشق بعض اوقات اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ انسان اس چیز یا اس شخص کے علاوہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور اپنے آپ کو فراموشی کے سپرد کر دیتا ہے اور جو شخص اپنے آپ کو بھول جائے وہ اپنی منفعت کو بھی بھول جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب انسان اپنے محبوب یا اپنے مقصد کے علاوہ کسی چیز کو نہیں پہچانتا اور اپنے محبوب کی خوشنودی کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا اور عوض و معاوضہ کے اس قانون کو قطعاً نظر انداز کر دیتا ہے جس پر عام حالات میں عملدر آمد ہوتا ہے اور ایک چیز دے کر دوسری لی جاتی ہے اور اپنے ہدف کی خاطر اس کی فداکاری، ایثار اور بے نفسی اس مرحلے پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے محبوب اور ہدف کو بھی بھول جاتا ہے جس کا تصور اس کے جسم و جان کو راحت بخشتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی اور روحانی لذتیں تو در کنار وہ اس حالت میں درحقیقت اپنے آپ کو دیکھتا اور پہچانتا بھی نہیں۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے بعض اوقات "مقام فنا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہمارے بہت سے بزرگ پیشوا ذاتِ خداوندی کے حضور میں یہی حال رکھتے تھے اور یہی حالت اس امر کا سبب بنتی تھی کہ وہ اس کی عبادت اس کی ذاتِ پاک کی خاطر کرتے تھے اور اس کی ذات کے لیے جو کہ عین کمال و جمال ہے عشق اختیار کرتے تھے اور اسے خود اس کی قربت کے لیے چاہتے تھے اور اس کی رضا جوئی کے لیے جانبازی اور فداکاری کرتے تھے۔

ایک حدیث جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے عبادت کے بارے میں نقل کی گئی ہے شاید اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"بارالٰہا! میں تیری پرستش جہنم کے خوف یا تیری بہشت کے طمع کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ تیری پرستش کے لیے میرا محرک یہ ہے کہ میں نے تجھے عبادت کے لائق پایا ہے۔"

خود حضرت علی علیہ السلام ان دعاؤں اور مناجاتوں کا مظہر تھے کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کے جمالِ حق اور کمالِ بے مثال میں اس قدر غرق ہوتے تھے کہ انہیں اپنے پاؤں سے تیر نکالے جانے کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ اس قسم کا انسان کوئی عمل انجام دیتے وقت یا خدائے تعالےٰ کی پرستش کرتے وقت اپنے نفع یا نقصان کے بارے میں نہیں سوچ سکتا کیونکہ وہ جب دیکھتا ہے تو خدا کو دیکھتا ہے اور جو کچھ بھی کرتا ہے اپنی خاطر نہیں بلکہ اسی کی خاطر کرتا ہے۔

آیۂ شریفہ "یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ" کا کیا مقصد ہے؟

سوال: اللہ تعالیٰ کی "عدالت" ہم مسلمانوں کے اصولی عقائد میں سے ہے اور ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر کے تمام کام عدل اور حکمت کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں۔ اس حقیقت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سورۂ نحل کی ۹۳ ویں آیت کے جملہ "اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے" اور اسی جیسے دوسرے ارشادات کا کیا مقصد ہے؟ اگر ہدایت اور گمراہی خدا کی مرضی پر ہے تو یہ بات عدلِ الٰہی سے کیونکر مطابقت رکھتی ہے کہ ہمیں گمراہی کے جرم کی سزا دی جائے اور ہدایت کے بدلے جزائے خیر دی جائے؟

جواب: قرآن مجید کی آیات ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں۔ بہت سی آیات ایسی ہیں جنہیں ایک دوسری کے پہلو بہ پہلو رکھنا چاہیئے تاکہ انہیں ایک دوسری کے ساتھ ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے معانی واضح ہو جائیں۔

موردِ سوال آیت جو "ضلالت اور ہدایت" کے بارے میں کلام کرتی ہے وہ بھی ایسی ہی آیات کے زمرے میں آتی ہے لہٰذا اس آیت شریفہ کے مکمل معنی سمجھنے کے لیے ہمیں ان دوسری آیات سے رجوع کرنا چاہیے جو ضلالت اور ہدایت کے بارے میں بتاتی ہیں۔

اس آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ "اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے"۔ قرآن کی دوسری آیات مثلاً سورۂ بقرہ کی ۲۶ ویں آیت میں کہا گیا ہے کہ: "یوں اللہ گنہگاروں کے سوا کسی کو گمراہ نہیں کرتا"

علاوہ ازیں سورۂ مومن کی ۳۴ ویں آیت میں کہا گیا ہے کہ: "خدا ہر بے ایمان مُسرف کو گمراہ کرتا ہے"

یہ دو آیتیں اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ بعض لوگ کس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی سے محروم ہو جاتے ہیں اور زندگی اور خوش بختی کے سیدھے راستے سے دور جا پڑتے ہیں۔ ان دو آیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم اس پہلی آیت (جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے) کے معنی واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جب ہم آخری دو آیات کو پہلی آیت کے پہلو بہ پہلو رکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ پہلی آیت کے مضمون کے مطابق جو لوگ پروردگار کی ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں وہ کوئی اور نہیں بلکہ گنہگار، بے ایمان اور ظالم افراد ہی ہیں۔

چنانچہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بدکار اور بے راہرو افراد کی رحمت الٰہی سے محرومی اور گمراہی ایک بالکل فطری امر ہے۔ ہر انسان کی خوش بختی اس چیز سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے وجود کی تمام مادی اور معنوی قوتوں اور صلاحیتوں کی تربیت صحیح طریقے سے کرے اور علمی اصطلاح کے مطابق ان قوتوں کو "فعلیت" کے مقام پر لے آئے اور اس روحانی اور جسمانی تربیت اور انسانیت کے شایانِ شان خوش بختی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ان احکام اور تعلیمات کی پیروی کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے گرامی قدر پیغمبروں کی معرفت بنی نوعِ انسان کے لیے بھیجی ہیں۔ جو لوگ ان تعلیمات اور احکام سے سرتابی کرتے

ہیں اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں وہ خوش بختی کے حصول سے باز رہتے ہیں۔ پھر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور رحمت ان کے شامل حال ہو اور وہ ہدایت پائیں۔ وہ توفیق الٰہی کے حصول کی استعداد کھو بیٹھتے ہیں اور سابقہ آیات میں "ان کے گناہ کی وجہ سے گمراہ ہو جانے" کی جانب جو اشارہ کیا گیا ہے کے معنی بھی یہی ہیں۔

سورۂ نساء کی ۷۹ ویں آیت میں اس حقیقت کی جانب ایک اور شکل میں اشارہ ہوا ہے اور خداوندِ عالم یوں فرماتا ہے:

"زندگی میں جو خیر اور نیکی تجھے پہنچتی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور تو جس شر اور گمراہی میں گرفتار ہوتا ہے وہ خود تیری جانب سے ہے۔"

دوسرے جملے میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہر قسم کی گمراہی اور زندگی کے صحیح راستے سے بھٹک جانے اور اس کے نتیجے میں انسان کے شایانِ شان خوش بختی سے محروم ہو جانے کی وجہ خود انسان اور اس کے اعمال ہیں۔

جس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس میں جس ہدایتِ الٰہی کی جانب اشارہ ہوا ہے (اور وہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے) اس کا مطلب بھی ایسا ہی ہے۔ اس ہدایت سے مراد اللہ تعالےٰ کا وہی فضل اور کرم ہے جو اس کے صالح بندوں کے شامل حال رہتا ہے۔ یہ افراد آسمانی احکام اور تعلیمات پر عمل کر کے ہر روز توفیقِ الٰہی کے حصول کے لیے اپنی استعداد اور قابلیت میں اضافہ کرتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہوتے ہیں۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ ہدایتِ الٰہی سے مراد نیک کاموں اور نیک بختی اور سعادت کے راستوں میں اللہ تعالےٰ کی توفیق اور امداد ہے اور یہ ان لوگوں کیلئے مخصوص ہے جو راہِ حق پر گامزن ہوتے ہیں اور اس راستے میں جہاد کرتے ہیں۔

"جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا انہیں ہم ضرور اپنی راہ کی ہدایت کریں گے۔" (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۹)

ضلالت سے مراد اس توفیق کا سلب کر لیا جانا اور اس خدائی امداد کا منقطع ہو جانا

گنہگاروں، ظالموں، مسرفوں اور بے ایمان افراد کے لیے مخصوص ہے۔ ورنہ اللہ تعالےٰ بلاوجہ نہ تو کسی کو ہدایت کرتا ہے اور نہ ہی کسی کو اپنی ہدایت سے محروم رکھتا ہے۔

ہماری مطبوعات

اسلام دینِ فطرت
اسلام دینِ معاشرت
اسلام دینِ معرفت
اسلام دینِ حکمت
فلسفۂ معجزہ
فلسفۂ شہادت
فلسفۂ ولایت
فلسفۂ حجاب
فلسفۂ احکام
تاریخِ عاشوراء
گفتارِ عاشوراء
بنائے کربلا
مرگِ گُل رنگ
مکتبِ اسلام
مکتبِ رسولؐ
مکتبِ تشیّع
آخری فتح
انتظارِ امامؑ
توضیح المسائل اردو
توضیح المسائل فارسی
شریعت کے احکام
کتابُ الدعاء والزیارات
اعمالِ حج
حکایاتُ القرآن
حیاتِ انسان کے چھ مرحلے
مقالاتِ مطہری
بُت شکن
مَردِ انقلاب
ہار جیت
بہلول عاقل
فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَۃِ
سخن
ابُوطالب۔ مظلومِ تاریخ
تفسیر سورۃ حمد
شرحِ قرآن
سیر و سُلوک
یَسَّرْنَا القرآن
غدیر کی برکتیں
تعلیماتِ اسلامی
حدیثِ کِساء
دُعائے کمیلؒ

نیز بچّوں کے لیے دل چسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں!

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان